For more books visit www.4Urdu.com
A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

و ابرو کا اشارہ سمجھنے میں اس وقت فوجی ٹولہ میں سب سے زیادہ ماہر قیافہ شناس تھے۔ مارشل لاء حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے وہ ہر چیز میں کیڑے نکالنے کے رسیا تھے' اور زندگی کے ہر شعبہ میں تطہیر اور اصلاح کا راستہ وہ اپنے "فوجی فلسفہ انقلاب" میں تلاش کیا کرتے تھے۔ یہ خود ساختہ فلسفہ انقلاب چند ڈرامائی اقدامات پر مبنی تھا' جو بریگیڈیئر صاحب کے جوش خطابت اور جوش عمل کے بل بوتے پر وقتی ابال کی طرح رونما ہوتے تھے' اور کچھ عرصہ کے بعد گیس چھوڑتی ہوئی کوکا کولا کی بوتل کی طرح بدمزہ ہو کر کاٹھ کباڑ میں پھینک دیئے جاتے تھے۔ سب سے پہلے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے دو منسٹروالنٹری گروپ کے نام سے چند فیشن ایبل خواتین کو جمع کر کے ایک انجمن بنائی' جن کا نعرہ تھا کہ وہ صرف پاکستانی کھدر پہنیں گی' اور باہر سے آیا ہوا بناؤ سنگھار کا کوئی سامان استعمال نہ کریں گی۔ نام کی حد تک تو بیگم ایوب کو اس انجمن کا سرپرست بنایا گیا تھا' لیکن عملی طور پر وہ ہمیشہ اس قسم کی کارروائیوں سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔ اس لیے اس انجمن کی باگ ڈور ایسی سادگی پسند خواتین کے ہاتھ میں رہی۔ جنہوں نے دیسی کھدر میں بھی ایسے ایسے نقش و نگار اور گل بوٹے کھلائے کہ ایک ایک لباس کی قیمت ریشم و کمخواب سے باتیں کرنے لگی۔ "سادگی اپناؤ کی یہ تحریک تھوڑا سا عرصہ چند وزیروں اور سیکرٹریوں کی فیشن ایبل بیگمات کے دم قدم سے آراستہ و پیراستہ دیوان خانوں میں چلی اور پھر اپنے آپ خاموشی سے دم توڑ گئی۔ بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کو گلہ تھا کہ ملک کا پریس اس قدر بے حس ثابت ہوا کہ اس نے اس انقلابی تحریک کی خاطر خواہ پذیرائی تک نہ کی۔

اس کے بعد بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے فوجی انقلاب کا بول بالا کرنے کے لیے ایک اور ہتھکنڈا استعمال کیا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح صدر ایوب کو قائل کر لیا کہ ملک میں سب خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ وزیروں اور سیکرٹریوں وغیرہ کی موٹر کاروں پر جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ اس سے عوام اور حکومت کے نمائندوں کے درمیان فاصلہ

For more books visit www.4Urdu.com

بڑھتا ہے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ کابینہ کی ایک میٹنگ میں کافی تلخ بحثا بحثی اور ردوکد کے بعد وزیروں اور سول افسروں کی کاروں سے تمام جھنڈے اتار لیے گئے۔

URDU4U.COM

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کے نزدیک پرانے اور بوسیدہ سیاسی نظام کے تابوت میں انقلاب کی یہ آخری کیل تھی' لیکن رفتہ رفتہ جب یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اس فیصلے سے برگیڈیئر صاحب کی اپنی ذات کے علاوہ اور کسی کا اعتماد نفس بلند نہیں ہوا' تو بہت جلد وزیروں اور افسروں کے جھنڈے ازسر نو اپنی اپنی کاروں پر اسی آب و تاب سے لہرانے لگے۔ اس پر بھی ایف۔ آر۔ خان کے دل میں یہی خیال پیدا ہوا کہ اتنا عظیم انقلابی اقدام بھی قومی پریس کی سرد مہری' بے رخی اور عدم توجہی سے ملک میں اپنا جائز مقام حاصل نہ کر سکا۔

صدر ایوب کو شکایت تھی کہ پاکستان کا پریس بہت زیادہ زودحس ہے۔ اس کے برعکس بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کے نزدیک قومی پریس بے حسی کا شکار تھا۔ مارشل لاء حکومت کے چند دوسرے اراکین کا خیال تھا کہ پاکستان پریس متلون مزاج ہے۔ موقع و محل دیکھ کر زودحسی اور نازک مزاجی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اور جب جی چاہتا ہے بے رخی اور بے حسی اختیار کر لیتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی حکومت کے چھوٹے بڑے سب اراکین سب سے پہلے روزنامہ اخبارات کی سرخیوں سے دوچارہ ہوتے ہیں۔ کہیں سرکاری توقعات اور خواہشات میں تضاد اور تصادم نظر آتا ہے' کہیں ذاتی احساسات ابھرتے ہوئے یا کچلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے سرکاری عہدہ داروں کی اکثریت پریس کی روش میں پریس کے معیار کو اپنے اپنے داخلی پیمانے سے ناپنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے اپنے نو ساختہ بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن میں چند لوگوں کو ٹاسک فورس کا نام دے کر انہیں یہ کام تفویض کیا کہ وہ پاکستانی پریس کے نفسیاتی اور دیگر احوال و کوائف پر جلد از جلد ایک مطالعاتی رپورٹ پیش کریں۔ یہ رپورٹ میری نظر سے تو نہیں گزری' لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس

For more books visit www.4Urdu.com

ٹاسک فورس نے تحقیق و تفتیش کا جو پہاڑ کھودا اس میں سے صرف پریس کمیشن کی چوہیا برآمد ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بریگیڈیئر صاحب کی زبان پر ہمہ وقت "پریس کمیشن" کی اصطلاح تکیہ کلام کی طرح جاری ہو گئی اور اب جہاں کہیں اخبارات کے متعلق کوئی سوال اٹھتا تھا۔ وہ نہایت وثوق سے سب کو پریس کمیشن کی رپورٹ کے آنے تک انتظار کرنے کا مشورہ دیتے تھے' جس کے بعد ان کے زعم میں پاکستان میں اپنے عہد سعادت کا دور شروع ہو جائے گا۔

پریس کمیشن کا تاریخی پس منظر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ کمیشن ستمبر ۱۹۵۴ میں قائم ہوا تھا۔ ہائی کورٹ کا ایک سابق جج اس کا چیئرمین تھا اور کمیشن کے ۱۳ ممبروں میں سے ۹ ممبر اخبارات کے ایڈیٹروں پر مشتمل تھے۔ اس زمانے میں پاکستان ایڈیٹروں کی دو متوازی اور عام طور پر متحارب تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ ایک کا نام آل پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس تھا اور دوسری کونسل آف پاکستان ایڈیٹرز کہلاتی تھی۔ ان ۹ ایڈیٹروں میں سے کچھ ایک تنظیم کے ساتھ وابستہ تھے۔ کچھ دوسری تنظیم کے ساتھ منسلک تھے۔ غالباً اس وجہ سے کمیشن میں صحافت کے بیشتر معاملات پر اتفاق رائے کا شدید فقدان رہا اور پورے چار برس تک پریس کمیشن کے کام میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

مارشل لاء کے نفاذ سے ایک ماہ قبل حکومت نے ستمبر ۱۹۵۸ء میں پریس کمیشن کی تنظیم نو کی۔ نئی تشکیل کے مطابق کمیشن کا ایک چیئرمین اور ۵ ممبر مقرر ہوئے۔ ان ۵ ممبروں میں صرف ایک پیشہ ور صحافی شامل تھا' جسے ممبر سیکرٹری کے طور پر نامزد کیا گیا تھا۔ یہ کمیشن فوجی حکومت کی تخلیق نو نہ تھا' لیکن مارشل لاء لگتے ہی بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے اسے اس کے کام میں اس طرح مہمیز کرنا شروع کیا کہ اس نے اپنی رپورٹ آٹھ ماہ کے اندر اندر مکمل کر لی۔ بریگیڈیئر صاحب اپنی دھن کے آدمی تھے۔ انہوں نے پریس کمیشن کی رپورٹ کو آڑ بنا کر وزارت اطلاعات کے لائحہ عمل کو ایسے خطوط

For more books visit www.4Urdu.com

پر استوار کیا جس سے ایک اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور دوسرا نہایت برا۔
اچھے نتیجے سے میری مراد

The Working Journalists (Conditions of Service)
Ordinance No. XVI of 1960

URDU4U.COM

ہے جو ۲۷ اپریل کو صدر پاکستان نے جاری کیا۔ اس آرڈیننس کے طفیل ملک میں پہلی بار کارکن صحافیوں کی تنخواہ' الاؤنس اور شرائط ملازمت کو کسی قدر تحفظ حاصل ہوا۔ ویج بورڈ قائم ہوئے اور پیشہ ور صحافیوں کے لیے پراویڈنٹ فنڈ جاری کرنا قانونی پابندی قرار پائی۔

اس خوش آئند آرڈیننس سے صرف ایک روز پہلے ۲۶ اپریل ۱۹۶۰ء کو وہ قانون نافذ ہو چکا تھا' جو

The Press and publications Ordinance No. XV of 1968 کے نام سے موسوم ہے اور پاکستان کی دنیائے صحافت میں بجا طور پر "کالے قانون" کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس وقت مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ مجموعی طور پر ملک بھر کے اخبارات احتیاط پسندی سے کام لے رہے تھے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ کہیں بھی کوئی ایسے حالات رونما نہ ہو رہے تھے جو اس سخت گیر قانون کے نفاذ کو صحیح یا حق بجانب ثابت کر سکتے۔ دراصل فوجی زندگی کی تربیت اور تجربات نے صدر ایوب کو زیادہ تر "یس سر" اور "جی ہاں" سننے کا خوگر بنا رکھا تھا۔ ان کے نکتہ نظر پر معمولی سی تنقید یا انحراف ان کو چیں بجبیں کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ صحافت کے متعلق چند ایسے تعصبات بھی تھے جو زمانہ دراز سے ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ اپنے دوسرے اصلاحی منصوبوں کی طرح وہ جرنلزم کے پیشے کو بھی بزعم خود مثبت خطوط پر منظم کرنے اور سنوارنے کے خواہشمند تھے۔ بدقسمتی سے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کی ذات میں ان کو ایک ایسا باصلاحیت اور اطاعت پذیر سیکرٹری اطلاعات مل گیا' جو ان کے ذرا سے اشارے پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لیے ہر وقت کمر بستہ کھڑ

For more books visit www.4Urdu.com

رہتا تھا۔ جب اس نے وزارت اطلاعات کی پٹاری سے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس کا مسودہ برآمد کر کے کابینہ میں منظوری کے لیے پیش کیا' تو سب نے بڑی خوش دلی سے اس پر آمنا و صدقنا کہا۔ اس وقت کابینہ میں بیشتر وزیر ایسے تھے جنہوں نے بڑے بڑے سول اور ملٹر عہدوں کی پناہ میں زندگی گزاری تھی اور ملک میں ایک ایسا پریس جو ان کی ذات اور وزارت کو ہدف تنقید نہ بنا سکے۔ ان کے لیے انتہائی مرغوب خاطر تھا۔ اپنی تمام تر ناقابل قبول سختیوں اور پابندیوں کے باوجود اس قانون میں صرف ایک مد ایسی تھی جسے کسی قدر اطمینان بخش کہا جا سکتا تھا۔ وہ یہ تھی کہ چھاپہ خانوں کے زرضمانت کی ضبطی وغیرہ کے متعلق تمام امور کا فیصلہ انتظامیہ کی بجائے عدلیہ پر چھوڑا گیا تھا' لیکن تین سال کے اندر اندر حالات نے پلٹا کھایا اور اگست ۱۹۶۳ء میں جب مغربی پاکستان کی صوبائی حکومت نے اسی آر ڈی ننس کو انتہائی ترمیم شدہ حالت میں ازسر نو جاری کیا' تو یہ مد بھی غائب ہو گئی جون ۱۹۶۲ء میں مارشل لاء اٹھ گیا تھا' اور نئے آئین کے تحت بنیادی جمہوریت کے نظام کا درد شروع ہو گیا تھا۔ مارشل لاء کے دوران انہوں نے مجبوراً اپنے اوپر اوڑھ رکھا تھا۔ زور خطابت سے اپنی جولانی طبع دکھانے کے لیے نئے اور پرانے سیاستدانوں کو اسمبلیوں کے ایوان بھی تا نہ تا نہ ملے تھے' چنانچہ اسمبلیوں کے اندر اور باہر اور اخبارات کے صفحات پر جو کچھ ظہور میں آیا وہ نارمل حالات میں تو بالکل طبعی' باقاعدہ اور معمولی واقعات تھے' لیکن مارشل لاء کی چھتری کے نیچے چھائے ہوئے جھوٹے سکون میں یہ سارا ہنگامہ انتہائی شدید طوفان نظر آتا تھا حکومت کے اراکین جو پہلے مارشل لاء کے حفاظتی حصار میں بیٹھے تھے۔ اب کھلم کھلا عوام اور صحافت کی بے رحم سرچ لائٹ کے نیچے آ گئے۔ اس صورت حال سے صدر ایوب بھی پریشان تھے اور کابینہ میں ان کے بہت سے رفیق بھی بے حد بوکھلائے ہوئے تھے۔

اس پریشانی اور بوکھلاہٹ کا مجھے براہ راست ذاتی علم ہے۔ اس وقت تک وزارت اطلاعات سے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کا بستر گول ہو چکا تھا اور وہ جی۔ ایچ۔ کیو میں کسی

For more books visit www.4Urdu.com

بے ضرر اہم اور غیر اہم اسامی کی پول میں دھانس دیئے گئے تھے۔ اسکے بعد وزارت اطلاعات کے کانٹوں کی مالا پہلے مسٹر نذیر احمد نے اور پھر سید ہاشم رضا نے یکے بعد دیگرے پہنی۔ مارشل لاء اٹھانے اور نیا آئین نافذ کرنے کے موقع پر اس وزارت کا چارج سنبھالنے کے لیے صدر ایوب کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی۔ اس وزارت میں قدم رکھتے ہی صدر سے لے کر وزیروں تک فرمائشوں کی وہ بوچھاڑ شروع ہوئی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ کسی کو گلہ تھا کہ اس کی تصویر نہیں چھپی۔ کسی کو شکایت تھی کہ اس کے بیان یا تقریر کا پورا متن نہیں چھپا۔ کوئی کہتا تھا کہ فلاں تنقید غلط ہے اور حکومت کا وقار گرانے کے لیے اچھالی جا رہی ہے۔ عام مخلوق خدا کی طرح کبھی کبھی کچھ وزیر صاحبان بھی وقتہ فوقتہ بیمار پڑتے رہتے تھے۔ ان میں سے چند ایسے تھے کہ اگر ان کی بیماری کی خبر اخبار میں شائع ہو جاتی تھی' تو وہ اسے شرانگیزی کا شوشہ قرار دیتے تھے جو اخبار والے ان کی وزارت ختم کرنے کے لیے خواہ مخواہ چھوڑتے رہتے ہیں۔ اخباری دنیا میں صدر مملکت کی ذات کے ساتھ شائستگی اور احترام کا سلوک روا رکھنے کی رسم عام تھی اور ذاتی طور پر صدر کو کسی انتہائی شدید اور غیر مناسب تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا' لیکن جب گوہر ایوب کے نام گندھارا انڈسٹریز کی منتقلی کا کھڑاگ کھڑا ہوا' تو یہ امتیاز بھی اٹھ گیا اور اس معاملے پر نکتہ چینی اورے لے دے کا وہ طوفان برپا ہوا جو اپنی شدت میں بے مثال تھا۔ صدر کے وزیروں اور رفیقوں میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جو اس موقع پر انہیں تحمل' تدبر اور ضبط نفس کا مشورہ دے سکتا۔ اس کے برعکس سب لوگ انہیں ایڑ لگا لگا کر اسی راستے پر گامزن رکھنا چاہتے تھے جو انہوں نے میرے خیال میں غلط طور پر اختیار کر رکھا تھا۔ وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے ایک خفیہ سی پریس کانفرنس منعقد کی اور اعداد و شمار کی شعبدہ بازی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ گندھارا انڈسٹریز کی تجارتی کارروائی میں ہرگز کوئی پیچیدگی نہیں اور یہ انتہائی کھرا' بے لاگ اور صاف سودا ہے' لیکن ان کی منطق کسی کو قائل نہ کر سکی۔ بلکہ الٹا یہ اثر چھوڑ

For more books visit www.4Urdu.com

گئی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے جسے چھپانے کی اتنی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ ایک وزیر نے تو اسمبلی کے ایوان میں کھڑے ہو کر یہاں تک اعلان کر دیا کہ اگر صدر مملکت کا بیٹا گندھارا انڈسٹریز کا حقدار نہیں مانا جاتا' تو کیا اسے کسی یتیم خانے میں داخل کر دیا جائے؟ ہر وزیر اخبار والوں پر حسب توفیق لعن طعن کر رہا تھا کہ گندھارا انڈسٹریز کی آڑ میں قومی صحافت سربراہ مملکت کے وقار کو مجروح اور حکومت وقت کی بنیاد کو کمزور کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سننے کی بھلا کہاں گنجائش تھی؟ پھر بھی میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ سیکرٹری اطلاعات کے طور پر اپنا سرکاری اور صدر ایوب کے ساتھ ذاتی خلوص کی بنا پر اپنا اخلاقی فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کروں۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں ایک تحریری نوٹ پیش کیا جس میں میں نے نہایت ادب سے صدر محترم کو دو برس پہلے کا ایک واقعہ یاد دلانے کی جسارت کی' جب کہ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے باضابطہ کارروائی کے بعد مرکز کے وزیر صنعت مسٹر ابوالقاسم خان کو چٹاگانگ میں ایک جوٹ مل قائم کرنے کی منظوری دی تھی۔ جب میں نے یہ فائل صدر ایوب کی خدمت میں پیش کی' تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس پر یہ احکام صادر فرمائے تھے کہ "استحقاق کی بنا پر مسٹر ابوالقاسم یہ کارخانہ لگانے کے جائز طور پر حقدار ہیں' لیکن انقلابی کابینہ کے وزیر کی حیثیت سے ان کا یہ اقدام غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے میں درخواست کروں گا کہ مسٹر ابوالقاسم اس منظوری سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں۔"

اس کے بعد میں نے اپنے نوٹ میں صدر ایوب سے پرزور اپیل کی تھی کہ گندھارا انڈسٹریز کے سلسلے میں بھی اگر وہ اپنے وضع کردہ اس سنہری اصول کو زیر عمل لائیں۔ تو بہت سی غلط فہمیوں کا خود بخود سدباب ہو جائے گا۔

صدر ایوب نے میرا نوٹ پڑھا تو ضرور لیکن اسے بلا تبصرہ میرے پاس ویسے ہی واپس بھیج دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں بات ناگوار گزری ہے۔ رفتہ رفتہ ان کے زیرک اور پرفراست چہرے میں مجھے واضع طور پر یہ آثار بھی نظر آنا شروع ہو گئے کہ

For more books visit www.4Urdu.com

وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے میری پہلی سی افادیت برقرار نہیں رہی۔

اسی زمانے میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ایک روز صبح صدر ایوب راولپنڈی سے مری روانہ ہونے والے تھے جہاں انہوں نے دن کے دس بجے نواب کالا باغ اور چند مرکزی وزراء کے ساتھ ایک میٹنگ مقرر کی ہوئی تھی۔ میٹنگ میں حکومت اور اراکین حکومت کے خلاف ملک کے اخبارات کا رویہ زیر بحث آنا تھا۔

روانگی سے پہلے صدر نے مجھے فون پر کہا کہ راستے میں وہ میرے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں ان کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھ کر مری چلوں۔ ٹھیک آٹھ بجے صبح میں صدر ایوب کی ائرکنڈیشنڈ کار میں ان کے ساتھ مری روانہ ہونے کے لیے بیٹھ گیا۔ اس خنک اور آرام دہ ماحول میں اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پل بھر کے لیے مجھے کچھ اونگھ سی آ گئی ہو میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں صدر ایوب نے مجھے اونگھتے ہوئے تو نہیں دیکھ لیا' لیکن وہ کسی قدر آزردگی سے خفا خفا منہ پھلائے بیٹھے تھے' کیونکہ راولپنڈی سے مری تک سارا راستہ میں گہری نیند سو رہا تھا اور اب ہماری گاڑی مری پہنچ کر گورنر ہاؤس میں داخل ہو رہی تھی۔

"میں باتیں خاک کرتا۔" صدر ایوب نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا۔ "تم تو گھنٹہ بھر گہری نیند سوتے رہے۔"

جواب میں میرے پاس کچھ بھی کہنے کو نہیں تھا۔ میں نے شرمندہ ہو کر اقبالی مجرم کی طرح اپنی گردن جھکا لی اور خاموش رہا۔

میری شدید الجھن' پریشانی اور ندامت بھانپ کر صدر ایوب کسی قدر پسیجے اور مسکرا کر بولے' "ایسے حالات میں اتنی گہری نیند اسی کو آ سکتی ہے۔ جس کے ضمیر کا بوجھ نہایت ہلکا ہو۔"

میٹنگ کے کمرے میں پہنچ کر صدر ایوب نے غالباً لطیفہ کے طور پر یہ واقعہ سب کو سنایا۔ چند ایک حضرات نے خوشامداً فرمائشی قہقہے لگائے' لیکن نواب کالا باغ اور دو تین وزراء بدستور سنجیدہ رہے اور انہوں نے کن انکھیوں سے کئی بار مجھے بری طرح گھورا۔

For more books visit www.4Urdu.com

حکومت کے متعلق مختلف اخبارات کے رویہ پر گفتگو شروع ہوئی' تو ایک مرحلے پر نواب کالا باغ نے کہا۔ "جناب' میں نے تو صبح کے وقت اخبار پڑھنا ہی ترک کر دیا ہے۔ آج کل اخبارات ہمارے اوپر اتنی گندگی اچھالتے ہیں کہ صبح صبح انہیں پڑھ کر بلڈ پریشر بڑھتا اور طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دن بھر کام ٹھیک طرح نہیں ہوتا۔"

"یہ سن کر وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے پوچھا۔ "نواب صاحب' اگر آپ اخبارات کو پڑھتے ہیں تو پھر نیند کیسے آتی ہے؟"

نواب کالا باغ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔ "یہ راز تو مسٹر شہاب سے پوچھئے۔"

مسٹر محمد شعیب نے بھی طنز کا نشتر چلا کر پھبتی اڑائی۔ "ہاں بھئی شہاب۔ یہ گر ذرا ہمیں بھی تو سکھاؤ۔"

ان دونوں حضرات کا یہ طعن آمیز انداز گفتگو سن کر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے گزارش کی۔ "سر' گورنر مغربی پاکستان اور وزیر خزانہ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ انسانی کمزوری کے ایک معمولی سے واقعہ کو آڑ بنا کر وہ مجھے اس طرح طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں۔ ان دونوں کے اس نامناسب رویہ پر میں آپ کی خدمت میں شدید احتجاج کرتا ہوں۔"

نواب صاحب کی عادت تھی کہ غصہ فرو کرنے کے لیے وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنی گھنی مونچھوں پر پھریرا کرنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ وہ تو ہونٹ بھینچ کر اس عمل میں مصروف ہو گئے' لیکن وزیر خزانہ مسٹر شعیب طیش کھا کر آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے غصے سے کپکپاتی ہوئی آواز میں زور زور سے چیخ کر وزارت اطلاعات اور میری ذات پر بے سرو پا شکایات اور الزامات کا دفتر کھول دیا۔ سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وزارت اطلاعات کا پریس والوں پر کوئی کنٹرول نہیں۔ اس کی وجہ یا نااہلیت ہے یا ملی بھگت ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

نااہلیت کا الزام تو میں بخوشی قبول کر لیتا مگر ملی بھگت کے متعلق میں نے شعیب صاحب سے مزید وضاحت طلب کی کہ اس سے ان کا کیا مطلب ہے۔

URDU4U.COM

جواب میں انہوں نے کئی دور از کار واقعات کا حوالہ دیا جن میں ایک یہ تھا کہ کسی وقت وزیر خزانہ میڈیکل چیک اپ کے لیے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے پریس آفیسر کو ہدایت دی تھی کہ یہ بات مکمل طور پر صیغہ راز میں رہے۔ لیکن اس کے باوجود چند اخباروں میں یہ خبر اس طرح شائع ہو گئی کہ وزیر خزانہ قلب کے عارضہ میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے ہیں۔ شعیب صاحب کا خیال تھا کہ یہ شر انگیز خبر صرف اس مقصد سے شائع کی گئی تھی کہ ان کو جسمانی طور پر معذور اور نکما ظاہر کر کے عوام کی نظر میں وزارت کے ناقابل اور نااہل قرار دیا جا سکے۔

گرمی گفتار کی رو میں میرے منہ سے یہ جواب نکل گیا کہ "عارضہ قلب تو ایک عام بیماری ہے۔ جو ہم سب کو کسی نہ کسی وقت لاحق ہو سکتی ہے' لیکن ہمارے ملک کے عوام تو اس قدر سیدھے' اطاعت شعار اور فرمانبردار ہیں کہ انہوں نے غلام محمد جیسے مفلوج' معذور اور اپاہج انسان کو عرصہ دراز تک سربراہ مملکت کی کرسی پر برضاو رغبت برداشت کیا۔

ماضی کے دریچے میں جھانک کر آج میں اس واقعہ پر دوبارہ غور کرتا ہوں' تو مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میرے لیے اس طرح کا جواب دینا غیر ضروری اور نامناسب تھا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میرا جواب سن کر شعیب صاحب غصے کے مارے کف در دہن ہو گئے۔ کچھ آواز انہوں نے بلند کی۔ کچھ بلند بانگی میری جانب سے اٹھی۔ یہ شور و شعب باہر سنائی دیا' تو صدر کا پرسنل باڈی گارڈ فوراً دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اسے دیکھ کر صدر ایوب کھسیانے سے ہو گئے اور ہم دونوں بھی جھینپ کر خاموش ہو گئے۔ صدر نے اسے حکم دیا کہ وہ باہر جا کر چائے بھجوائے۔

چائے کے بعد پریس کے معاملات پر دوبارہ میٹنگ شروع ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں اس مجلس میں ایک اجنبی کی طرح شامل ہوں۔ قومی پریس پر مضبوط کنٹرول

For more books visit www.4Urdu.com

قائم کرنے کے لیے نواب کالا باغ سے لے کر ہر وزیر باتدبیر اپنی بساط کے مطابق طرح طرح کے نسخے تجویز کر رہا تھا۔ ایک صاحب کراچی کے روزنامہ ڈان پر گرج برس رہے تھے۔ دوسرے صاحب کے غیض و غضب کا نشانہ لاہور کا روزنامہ نوائے وقت تھا۔ ان بس کی نظر میں یہ دو اخبار سانپ کے مثل تھے جو حکومت پر ڈنگ مارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ان دونوں اخبارات کے زہریلے دانت نکالنے کے لیے بھانت بھانت کی تدبیریں اور تجویزیں پیش ہو رہی تھیں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ "ڈان" اور "نوائے وقت" کو بھی "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کی طرح حکومت کے قبضے میں لے لینا چاہیے۔ اس پر صدر ایوب بگڑ گئے کہ حکومت کے قبضے میں آ کر "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" چل نہیں رہے' بلکہ رینگ رہے ہیں۔ اب مزید اخباروں کو قبضے میں لے کر حکومت کون سا نیا تیر مارے گی؟ اس قسم کا بے ترتیب اور مسمارکن مذاکرہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ "ڈان" اور "نوائے وقت" شائع کرنے والی کمپنیوں میں جو سرمایا لگا ہوا ہے۔ اس کے حصے داروں کی فہرست حاصل کی جائے' اور حکومت کے منتخب افراد اور اداروں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ حکمت عملی سے ان حصص کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر ان دونوں اخباروں کی شہ رگ اپنے ہاتھ میں قابو کر لیں۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک وزارتی کمیٹی بنائی جائے' جس کا فیصلہ بعد میں ہو گا۔

اس ساری بحث و تمحیص اور منصوبہ بندی کے دوران سب نے مجھے ایک اجنبی کی طرح نظر انداز کئے رکھا' جیسے کسی چھوت چھات کی بیماری کے مریض کو الگ تھلگ ایک طرف بٹھا دیا ہو۔ ساری بحثا بحثی میں کسی نے مجھ سے نہ کوئی سوال پوچھا نہ کوئی بات کی۔ جب میٹنگ برخاست ہونے لگی' تو ایک وزیر صدر سے کہا۔ "جناب میری درخواست ہے کہ اس میٹنگ کی کارروائی کابینہ کی روئیداد کی طرح خفیہ رکھی جائے اور یہاں پر جو کچھ کہا اور سنا گیا ہے وہ باہر نہ نکلنے پائے۔"

یہ بات سنتے ہی سب کی نگاہیں بے اختیار میری جانب اٹھ گئیں۔ مجھے غصہ تو بہت آیا'

For more books visit www.4Urdu.com

اور کچھ جلی کٹی سنانے کو جی بھی چاہا' لیکن موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ لنچ کا وقت ہو گیا تھا اور سب لوگ صدر ایوب کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے لیے بے تابی سے منتشر ہو رہے تھے۔ لنچ پر میں بھی مدعو تھا' لیکن ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے میں نے پریذیڈنٹ کے پرسنل سٹاف سے معذرت کر لی اور ایک دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر راولپنڈی چلا آیا۔

گھر پہنچا تو چار بجے کا عمل تھا۔ عفت بے چاری پریشان بیٹھی تھی۔ کیونکہ مری سے دو تین بار ٹیلی فون آ چکا تھا' جس میں میرا اتا پتہ پوچھا گیا تھا اور پیغام تھا کہ صدر صاحب نے شام کے چھ بجے مجھے ملنے کے لیے طلب فرمایا ہے۔ میں نے عفت کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور اسی وقت الٹے پاؤں مری کے لیے روانہ ہو گیا۔

شام کے چھ بجے صدر ایوب گورنر ہاؤس کے وسیع و عریض' سرسبز خوبصورت لان میں چہل قدمی کر رہے تھے' مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا اور بولے۔ "آج کا دن تمہارے لیے سخت گزرا۔ زیادہ پریشان تو نہیں ہو؟"

"نہیں سر۔" میں نے جواب دیا۔ "بلکہ مجھے اس بات پر ندامت ہے کہ آج میں دن بھر آپ کے لیے خواہ مخواہ درد سر بنا رہا۔"

کچھ دیر شش و پنج کی حالت میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں جی کڑا کر کے حرف مدعا زبان پر لے ہی آیا۔ "سر' میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے کام کی صلاحیت اور افادیت کا گراف اپنی حد کو چھو کر اب تیزی سے نشیب کی طرف گرنا شروع ہو گیا ہے۔"

صدر ایوب نے لمحہ بھر کے لیے ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھا' اور تیزی سے بولے:

Well, go ahead. What are you driving at?

میں نے پوری دل جمعی اور سکون سے کہا: "سر' ایسے حالات میں اصول اور غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔"

صدر ایوب چلتے چلتے رک گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "دیکھو شوہاب میں تمہیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی

For more books visit www.4Urdu.com

جو خواہ مخواہ ملازمت سے ہاتھ دھونے کی معقول وجہ بن سکے۔ اس لیے اس خام خیالی کو دل سے نکال دو۔"

صدر ایوب کے اس شفقانہ رویہ کا دل سے شکریہ و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وزارت اطلاعات میں میری پوسٹنگ اب بالکل بعید از کار اور بے معنی ہے۔"

URDU4U.COM

یہ سن کر صدر ایوب کچھ معنی خیز طور پر مسکرائے جس پر مجھے تعجب ہوا اور فرمانے لگے۔

"خیر' اس کے متعلق میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

چند ہفتہ کے بعد انہوں نے خود تو نہیں' لیکن اپنے پرسنل سیکرٹری مسٹر این' اے فاروقی کے ذریعہ مجھے یہ بتا دیا کہ مجھے وزارت اطلاعات سے سبکدوش کیا جا رہا ہے اور میری اگلی تعیناتی بعد میں طے کی جائے گی۔ فاروقی صاحب یہ پیغام لے کر اتوار کے روز دن کے بارہ بجے میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ میں نے کہا۔ "آج تعطیل کے روز آپ نے یہ زحمت کیوں اٹھائی؟ یہی بات صدر صاحب مجھے بلا کر یا فقط ٹیلی فون پر ہی بتا سکتے تھے۔"

"صدر صاحب کی آنکھ میں مروت بہت ہے۔" فاروقی صاحب بولے۔ "غالباً یہ ناخوشگوار فیصلہ وہ تمہیں خود نہیں سنانا چاہتے تھے۔"

یہ سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ کہاں کا ناخوشگوار فیصلہ؟ اور کیسی مروت؟ یہی پیشکش تو میں خود ہی چند ہفتہ قبل جناب صدر کی ذات گرامی میں پیش کر چکا تھا۔ اگلی ملاقات پر میں نے دبے لفظوں میں صدر ایوب کے ساتھ اس بات کا گلہ کیا' تو وہ کچھ جھینپ گئے اور ان کے چہرے پر کسی قدر سرخی سی دوڑ گئی۔ اپنا مافی الضمیر صاف صاف بیان کرنے کے لیے انہوں نے ایک طولانی سی تشریحی اور توضیحی تقریر کا سہارا لیا۔ یہ بات ان کی وضع اور معمول کی سراسر خلاف تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ "اخبارات کو راہ راست پر لانے کے لیے اب ہم نے سخت اقدامات کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس مقصد کے لیے پریس کے قوانین میں ترمیمیں کی جا رہی ہیں۔ نئے آئین کے تحت یہ تبدیلیاں صوبائی حکومتیں نافذ کریں گی۔"

For more books visit www.4Urdu.com

اتنا کہہ کر صدر ایوب نے نواب کالا باغ کی شان میں بہت سے تعریفی کلمات کہے اور بولے۔ "مجھے یقین ہے کہ نواب صاحب اخبار والوں کی مشکیں کس کر انہیں ایسا باندھیں گے کہ ان کو نانی یاد آ جائے گی۔"

URDU4U.COM

انکے بعد مجھے دلاسا دینے کے لیے صدر صاحب نے یہ خوشخبری سنائی۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تمہیں اس کارروائی میں شامل نہیں کیا جا رہا۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ سخت گیر اقدامات کا نبھانے کی صلاحیت طبع تم میں موجود نہیں۔ دوسرے رائٹرز گلڈ کے عہدے دار کی حیثیت سے آزادی تحریر وغیرہ کا ساتھ بھی دینا پڑتا ہے۔ میں اس کا برا نہیں مناتا۔ ایک روز تم میرے شکر گزار ہو گے کہ میں نے تمہیں صحیح وقت پر وزارت اطلاعات سے سبکدوش ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔"

صدر ایوب کی اس بات سے میں ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ کیونکہ میں صاف بھانپ گیا تھا کہ آج وہ میرے ساتھ روایتی صاف گوئی سے کام نہیں لے رہے۔ مجھے اس بات کا ذاتی علم تھا کہ ملک میں رونما ہونے والے چند واقعات اور حالات کا صدر کے ذہن پر اس قدر شدید دباؤ تھا کہ وزارت اطلاعات سے مجھے الگ کرنا ان کے لیے قریباً قریباً ناگزیر ہو گیا تھا۔ ان حالات اور واقعات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ان کو زبان پر لانا یا تسلیم کرنا ہرگز ان کی شان کے شایان نہ ہوتا۔ اس معاملے میں ان کا اخفا پسندانہ رویہ میرے نزدیک بالکل قدرتی اور قابل فہم ہے۔

ان واقعات کا پس منظر کسی قدر پرانا ہے۔ امریکہ کے ساتھ سالہا سال سے ہماری نہایت برخوردارانہ اور سعادت مندانہ طرز کی دوستی چلی آ رہی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان کا روس کے ساتھ گٹھ جوڑ تو بالکل عیاں تھا' لیکن امریکہ کے ساتھ بھارت کے تعلقات میں تجاہل عارفانہ اور سردمہری کا عنصر غالب رہتا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین کے ساتھ سرحدی جنگ میں ہندوستان کو شکست فاش ہوئی تو امریکہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ہندوستان کو اپنے حلقہ اثر میں لانے کے لیے اسے بے دریغ نہایت بھاری مقدار

For more books visit www.4Urdu.com

میں مالی اور فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ روس کے علاوہ امریکہ کی طرف سے بھی ہندوستان کو بے تحاشا فوجی امداد کی بھرمار دیکھ کر قدرتی طور پر پاکستان میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ ہمارے محب وطن اخبارات نے اس سنگین صورت حال کا پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ جائزہ لیا اور ملک بھر میں امریکہ کے اس رویے کے خلاف مخالفت' تنقید اور تنقیص کی ایک تیز لہر دوڑنے لگی۔ پاکستان میں امریکی سفارت کار غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ یہاں کی صحافت مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہے اور ہندوستان کو کثیر اور خطیر فوجی مدد دینے پر امریکہ کے خلاف جو کچھ تحریر ہو رہا ہے۔ وہ ضرور وزارت اطلاعات کے ایما پر لکھوایا جا رہا ہے۔ اس لیے امریکن ایمبیسی نے میرا نام اپنے ناپسندیدہ اشخاص کے کھاتے میں درج کر لیا۔

پاکستان رائٹرز گلڈ قائم ہوتے ہی امریکیوں سمیت چند عناصر اسے بلاوجہ بائیں بازو کے خطرناک ادیبوں کی پناہ گاہ سمجھنے پر مصر تھے۔ اس ادارے کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے میں پہلے ہی ان عناصر کے حملے میں اعتراض کی زد میں آیا ہوا تھا۔ اس پر مزید غضب یہ ہوا کہ فروری ۱۹۶۲ء میں جب وزیر خارجہ ذولفقار علی بھٹو چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ طے کرنے پکینگ گئے' تو صدر ایوب نے مجھے بھی ڈیلیگیٹ بنا کر ان کے ہمراہ بھیج دیا۔ امریکہ تو اس معاہدے پر ہی بے حد سیخ پا تھا' لیکن جب میرا نام وفد میں دیکھا تو یقیناً میرے متعلق ان کی ناپسندیدگی میں شدید اضافہ ہو گیا۔

چین سے واپسی کے چند ہفتے بعد اچانک ایک روز میں نے "ڈان" اخبار میں خبر پڑھی۔ خبر پڑھ کر میں نے وزیر خارجہ کو خط لکھا'

اس خط کی ایک نقل میں نے صدر ایوب کی خدمت میں پیش کی' تو انہوں نے اس پر یہ لکھ کر مجھے واپس کر دیا۔

I should treat such remarks with the Contempt they deserve
M.A.K
12/3
Mr. Shahab

میری توقع تھی کہ یہ قضیہ اب یہیں پر رفع دفع ہو جائے گا۔ لیکن یہ امید بر نہ آئی۔

For more books visit www.4Urdu.com

امریکہ سفارت خانہ انتہائی محنت سے کام کرتا رہا اور انہوں نے چار پانچ ماہ لگا کر مختلف اخباروں سے ایسے بے شمار تراشے جمع کئے جن میں ہندوستان کو بے اندازہ فوجی مدد دینے اور پاکستان کے تحفظ کو نظر انداز کرنے کے حوالے سے امریکن حکومت پر کڑی نکتہ چینی اور مذمت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا تھا۔ ان تراشوں کو سلائیڈ کی صورت میں منتقل کیا گیا اور ایک روز امریکی سفیر یہ سارا ساز و سامان لے کر ایک پروجیکٹر کے ساتھ پریذیڈنٹ ہاؤس میں آ دھمکا' وہاں پر اس نے کافی عرصہ سکرین لگا کر صدر ایوب کو ایک ایک سلائیڈ دکھائی اور ساتھ ہی مژدہ سنایا کہ امریکہ کے انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر جارج بال عنقریب ہی صدر کینڈی کے خصوصی' ایلچی کے طور پر پاکستان آنے والے ہیں اور جن امور پر وہ گفت و شنید کریں گے۔ ان میں پاکستان پریس کا رویہ بھی ایجنڈے میں شامل ہے۔ اسی زمانے میں ہمارے اخبارات میں یہ خبر بھی نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی کہ کسی تقریب میں امریکی سفیر مسٹر میکناٹی نے بڑے زعم سے فرمایا تھا کہ پاکستانی انتظامیہ کے چند نامرغوب افسروں کو تبدیل کرانا ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ سفارتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیر کبیر نے کسی افسر کا نام تو نہیں لیا تھا' لیکن صحافتی حلقوں کے مطابق یہ کوئی راز درون پردہ نہ تھا کہ سفیر صاحب کے بستہ ب میں میرا نام ضرور درج رجسٹر تھا!

ان پے در پے واقعات کا دھاوا اس قدر شدید تھا کہ اس کے دباؤ تلے صدر ایوب کا کسی قدر پریشان ہونا بعید از قیاس نہیں۔ خارجہ تعلقات میں وہ مرنجاں مرنج پالیسی کے حامی تھے۔ خاص طور پر امریکہ کے ساتھ تعلقات کے لیے ان کے دل میں نہایت نرم گوشہ تھا۔ پچھلے اٹھارہ بیس برس کے دوران امریکہ اور پاکستان میں مالی اور فوجی امداد کے جو گہرے رشتے قائم ہوئے تھے' انہیں پروان چڑھانے میں ایوب خان صاحب کی ذات کا بڑا عمل دخل تھا۔ بری فوج کے کمانڈر انچیف کے طور پر امریکہ کے ساتھ عسکری روابط' مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں انہوں نے اپنے منصب کی آئینی حیثیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ پاک امریکہ تعلقات کا یہ ڈھانچہ کانچ کا گھر تھا جس میں ذرا

For more books visit www.4Urdu.com

سی بے احتیاطی اور بے اعتدالی دراڑیں ڈال سکتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکہ کا رویہ مربیانہ اور پاکستان کا فدویانہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک سپرپاور کی طرح امریکہ کے اپنے مفادات ہر صورت میں پاکستان کے مفادات سے زیادہ اہم تھے۔ ہندوستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی ترنگ میں اگر پاکستان کے جذبات اور تحفظات کو قربان کرنا پڑتا ہے' تو ایسا کرنے میں امریکہ کو کوئی اخلاقی یا سیاسی رکاوٹ یا ہچکچاہٹ درپیش نہ تھی۔

ایک حقیقت پسند سربراہ مملکت کی طرح بین الاقوامی تعلقات کے اس زیر و بم اور پیچ و خم سے صدر ایوب بخوبی آشنا تھے۔ چنانچہ انہوں نے کسی قسم کی مقاومت اور مزاحمت کی بجائے رفع شر کے لیے آسان ترین رستہ یہ اختیار کیا کہ مجھے بیک بنی و دو گوش وزارت اطلاعات سے نکال باہر کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کارروائی کی اصلی وجہ انہوں نے پوشیدہ رکھی اور الٹا مجھ پر احسان دھر کے مجھے اس اخراج پر شکر گزار ہونے کی تلقین کی۔ لیکن صحافت کے مہم جو رپورٹر اس طرح کے راز ہائے دروں کا کھوج لگانے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ پہلے تو ایک خبر یہ شائع ہوئی کہ وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب سے اختلافات کی بنا پر میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے' لیکن حکومت نے فوراً اس کی تردید کر دی۔ اس کے بعد جب ہالینڈ میں سفیر کے طور پر میری تعیناتی کی خبر نکلی' تو پریس والوں نے اس تبدیلی کی وجوہات کا سراغ لگا لیا اور ملک کے بہت سے اخبارات نے بیرونی دباؤ کے تحت سرکاری ملازموں کے تبادلے پر اپنے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ کئی روز تک قومی اخباروں میں تبصروں اور اداریوں کا یہی موضوع رہا۔

میرے تبادلے کے سلسلے میں غیر ملکی مداخلت پر اخبارات کی خیال آرائیوں نے کچھ ایسی شدت اختیار کر لی کہ صدر کے پرنسپل سیکرٹری مسٹر این۔ اے فاروقی نے ایک پریس ریلیز میں ان قیاس آرائیوں کو قطعی بے بنیاد اور شر انگیز قرار دیا اور کہا کہ تمام سرکاری تبادلے ملکی ضروریات کے پیش نظر کئے جاتے ہیں اور حکومت پاکستان کسی حالت میں

For more books visit www.4Urdu.com

بھی کسی غیر ملکی طاقت کی مداخلت برداشت نہیں کرے گی۔

جولائی ۱۹۶۲ء کے آخر میں جیسے ہی یہ فیصلہ ہوا کہ میں نے سفیر بن کر ہالینڈ جانا ہے تو میں نے صدر ایوب سے درخواست کی کہ مجھے فوراً وزارت اطلاعات سے فارغ کر دیا جائے۔ تاکہ میں چند ہفتے یہاں چھٹی گزار کر ہالینڈ چلا جاؤں۔ اس بات پر وہ رضا مند نہ ہوئے کیونکہ مغربی پاکستان کے فنانس سیکرٹری الطاف گوہر جو میری جگہ مرکزی سیکرٹری اطلاعات بنائے جا رہے تھے۔ ان دنوں امریکہ گئے تھے۔ صدر صاحب نے حکم دیا کہ میں ان کے آنے تک بدستور اپنی جگہ کام کرتا رہوں۔

اگلے چھ سات ہفتے میرے لیے بڑے سوہان روح ثابت ہوئے۔ میں ناکام سیکرٹری اطلاعات ضرور تھا' لیکن کام کے لحاظ سے عملی طور پر عضو معطل بنا بیٹھا تھا۔ ان دنوں میرا کام صرف اتنا تھا کہ روٹین کے طور پر منسٹری کا بندھا ٹکا روزمرہ کا دستور العمل نبھاتا رہوں اس سارے عرصہ کے دوران پالیسی کا ایک معاملہ بھی میرے پاس نہ آیا۔

کافی عرصہ پہلے سے کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کے ساتھ میری ایک میٹنگ مقرر چلی آ رہی تھی ۲۵ اگست کو کونسل کا جو وفد راولپنڈی تشریف لایا۔ وہ مسٹر الطاف حسین (ڈان" میر خلیل الرحمٰن (جنگ) مسٹر عبدالسلام (پاکستان آبزرور ڈھاکہ) مسٹر تفضل حسین مانک میاں (اتفاق ڈھاکہ) مسٹر مجید نظامی (نوائے وقت) اور مسٹر کے۔ ایم۔ آصف۔ (پاکستان ٹائمز) پر مشتمل تھا۔

وفد نے مجھے چھ مدیروں کی فہرست دی جنہیں کورٹ آف آنر کے ممبران کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔ یہ کورٹ آف آنر اس مقصد کے لیے قائم ہو رہی تھی کہ صحافیوں کے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزیوں کا جائزہ لے کر جلد از جلد نمٹاتی رہے۔

وفد نے مجھے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے پانچ ریٹائرڈ ججوں کے نام بھی دیئے کونسل آف ایڈیٹرز کے خیال میں ان میں سے ہر ایک کورٹ آف آنر کا چیئرمین مقرر ہونے کی اہلیت رکھتا تھا۔ تاہم گورنمنٹ کے ساتھ باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے اس فہرست میں سے چیئرمین کا حتمی انتخاب حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

قومی صحافت کے اتنے سربرآوردہ ایڈیٹروں کی یہ پیش کش مجھے بڑی مثبت اور تعمیری نظر آئی۔ اس میٹنگ کی روئیداد کو میں نے فوراً ایک سرکاری یادداشت میں قلم بند کیا' اور اسے اپنے ساتھ لے کر اسی شام صدر ایوب کی خدمت میں پہنچ گیا' لیکن وہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔ میرے کاغذات پر انہوں نے ایک سرسری سی نظر ڈال کر ایک طرف رکھ دیئے اور کسی قدر جھلا کر ترشی اور تندی سے بولے۔ "اب یہ سب باتیں بالکل فضول ہیں۔ تم اس کام سے فارغ ہو رہے ہو۔ اب تمہیں خواہ مخواہ ان باتوں میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنا لائحہ عمل تیار کر لیا ہے۔ اب اگر عمل ہو گا تو اسی پر ہو گا۔"

میں اپنا سا منہ لے کر واپس آ گیا' اور اگلے آٹھ نو روز اپنے دفتر میں بیکار بیٹھا مکھیاں مارتا رہا۔ دسویں روز ۳ ستمبر کو خبر ملی کہ مغربی پاکستان کے گورنر نے پریس اینڈ پبلی کیشنز (ویسٹ پاکستان) (ترمیمی) آرڈی ننس ۱۹۶۳ء نافذ کر دیا ہے۔

West Pakistan Ordinance NO. [illegible] of [illegible]
(The Central Govt. Press and Publications Ordinance No. XV of [illegible]
was amenses in its application to the province of East Pakistan by East Pakistan Ordinance- (i) No.[illegible] of [illegible] (with effect from [illegible]rd September [illegible]) (ii) No.[illegible] of [illegible] (with effect from [illegible] Oct.[illegible])

اس قانون کا پھندا وقتاً فوقتاً مختلف ترمیموں کے ساتھ آج تک ہماری صحافت کے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں کو خوش فہمی تھی کہ ایوب کے دور کے بعد یہ کالا قانون اپنی موت آپ مر جائے گا۔ لیکن ہر دور میں یہ امید نقش برآب ہی ثابت ہوتی رہی۔ اندھے کے ہاتھ میں ایک بار لاٹھی آ جائے' تو وہ اس کے سہارے کے بغیر دو قدم چلنے سے بھی معذور ہو جاتا ہے۔ حکومت ایوب خان کے دور کی ہو یا یحییٰ کے یا کسی اور کی' ہر زمانے کے حکمران اسی قانون کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر پاکستان کے ارباب عقل و دانش کو برباد اور روشن خیالی اور فہم و فراست کے میناروں کو تاخت و تاراج

For more books visit www.4Urdu.com

کرتے رہے ہیں۔ ذہنوں پر روک تھام' بندش اور پابندی عائد کرنے والا ہر اقتدار کے دور میں قانون لازمی طور پر قوت تخلیق کو بنجر' بانجھ اور بے ثمر کر دیتا ہے۔ دھونس اور دھاندلی کا نشہ بھی شراب کی مانند ہوتا ہے دونوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

اس سانحہ کے دو تین روز بعد مسٹر الطاف گوہر امریکہ سے واپس تشریف لے آئے۔ ان کے آتے ہی میں نے وزارت اطلاعات کے استروں کی مالا ان کے گلے میں ڈال دی۔ میرے ساتھ ہی میرے دست راست محمد سرفراز کو بھی اس منسٹری سے فارغ کر دیا گیا۔ سرفراز صاحب میرے دیرینہ دوست اور ایک کہنہ مشق صحافی تھے' آزادی سے پہلے بھی دہلی میں خان لیاقت علی خان سمیت مسلم لیگ کے بہت سے اکابرین کے ساتھ ان کے گہرے روابط تھے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر آف نیوز کے طور پر انہوں نے بڑی نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک بغداد پکیٹ میں اطلاعات کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو پروگریسو پیپرز لیمیٹڈ حکومت کے قبضے میں آ چکے تھے۔ چنانچہ سرفراز کو اس ادارے کے اخبارات اور رسالے کا چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ یہ فرائض انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے نبھائے' لیکن ایک بات پر صدر ایوب ان سے بہت ناراض ہو گئے۔

وہ بات یہ تھی کہ صدر ایوب کے آئین کے خلاف چودھری محمد علی نے ایک نہایت سخت اور طویل بیان دیا تھا۔ اس بیان کو سب قومی اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ صحافی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے سرفراز نے بھی اسے "پاکستان ٹائمز" میں پورے کا پورا چھاپ دیا۔ اس پر صدر ایوب چراغ پا ہو گئے کہ سرکاری تحویل میں لیے گئے اخبار میں ان کے آئین کے خلاف اس بیان کا پورا متن کیوں شائع ہوا۔ میں نے سرفراز کے دفاع میں صحافتی تقاضوں کا کچھ ذکر کیا' تو صدر ایوب ترشی سے بولے۔ "صحافت جائے بھاڑ میں ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں؟ یہ سرفراز کی شرارت ہے۔ وہ ضرور درپردہ چودھری محمد علی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔"

For more books visit www.4Urdu.com

جب میں نے وزارت اطلاعات و نشریات کا چارج سنبھالا تھا تو صدر ایوب کی دلی خواہش کے برخلاف میں سرفراز کو اسی وزارت میں ڈائریکٹر جنرل آف پبلک ریلیشنز کے طور پر لے آیا تھا۔ اس عہدے پر انہوں نے نہایت دیانتداری اور وفاداری سے کام کیا۔ لیکن صدر ایوب کے دل و دماغ پر اس کے خلاف جو غبار چھایا ہوا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ صدر کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے وزیر صاحبان بھی سرفراز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ اب جب کبھی کسی وزیر یا وزارت کے بارے میں کوئی تنقیدی خبر شائع ہوتی تھی' تو سب یہی الزام لگاتے تھے کہ میری پشت پناہی میں سرفراز ہی یہ شرارتیں کروا رہا ہے۔

جونہی وزارت اطلاعات سے میرا بوریا بستر گول ہوا' اسی وقت سرفراز کو بھی نیویارک میں اقوام متحدہ میں پاکستان سفارت خانے کا پریس کونسلر بنا کر چلتا کیا۔

یو۔ این۔ او میں اپنی پسندیدہ شخصیت اور قابل قدر کارگزاری کی وجہ سے وہ اس زمانے کے سیکرٹری جنرل مسٹر او۔ تھانٹ کی نظروں میں آ گیا۔ دونوں کے درمیان کافی گہرے روابط قائم ہو گئے۔ کچھ برس بعد سیکرٹری جنرل نے سرفراز کو اردن میں U.N.D.P کا نمائندہ بنا کر عمان بھیج دیا۔

سرفراز نہایت خوش لباس' خوش کلام اور شاہانہ طبیعت کا انسان تھا۔ وہ گھوڑسواری کے علاوہ پولو' ٹینس اور سکواش کھیلنے کا شوقین تھا۔ عمان میں ایک روز وہ کسی شہزادے کے ساتھ سکوائش کھیل رہا تھا کہ اچانک اس پر دل کا دورہ پڑا اور آناً فاناً سکواش کورٹ ہی میں دم توڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• نیشنل پریس ٹرسٹ

۱۷ اپریل ۱۹۵۹ء کی تاریخ تھی۔ میں آرام سے سو رہا تھا کہ رات کے ساڑھے بارہ بجے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان فون پر بول رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگلی صبح میں کراچی ایئرپورٹ پر پہنچ جاؤں' کیونکہ ہم نے پہلے جہاز سے لاہور کے لیے روانہ ہونا ہے۔

میں نے کہا کہ میں صدر ایوب کی اجازت کے بغیر کیسے کراچی چھوڑ سکتا ہوں؟ علی الصبح جہاز کی روانگی سے پہلے ان کی اجازت کیسے حاصل کروں گا؟

"میں پریذیڈنٹ ہاؤس سے ہی بول رہا ہوں" بریگیڈیئر صاحب نے کہا۔ "صدر صاحب ابھی ایک اہم میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے بیڈروم میں چلے گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اجازت دی ہے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے جائیں۔"

"کس کام کے لیے؟" میں نے پوچھا۔

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے کہا کہ اس سوال کا جواب وہ ٹیلیفون پر نہیں دے سکتے۔

اگلی صبح میں ہوائی اڈے پہنچا' تو بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان لاہور جانے کے لیے موجود تھے۔ روانگی سے پہلے اور ہوائی جہاز کے سفر کے دوران میں نے کئی بار لاہور میں کام کی نوعیت کے متعلق پوچھا' لیکن کوئی ٹھیک ٹھیک جواب نہ مل سکا۔ ہر بار بریگیڈیئر صاحب اپنی عادت کے مطابق طویل تقریروں میں آئیں بائیں شائیں کر کے میرے سوال کا جواب گول کر جاتے تھے۔ اپنی دانست میں وہ چالاکی سے کام لے رہے تھے' لیکن میرے نزدیک یہ ایک طفلانہ سی حرکت تھی۔

لاہور کے ہوائی اڈے پر چند فوجی افسروں نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں گاڑیوں میں بٹھا کر سیدھے فلیگ سٹاف ہاؤس لے گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وزیر داخلہ جنرل کے۔

For more books visit www.4Urdu.com

ایم۔ شیخ بھی لاہور آئے ہوئے ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب تو لاہور کے جی۔ او۔ سی۔ کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ان کے دفتر کی طرف چل دیئے اور میں کافی دیر تک فلیگ سٹاف ہاؤس کے آراستہ و پیراستہ ڈرائینگ روم میں اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ ایک نہایت باادب' خلیق اور شائستہ نوجوان فوجی افسر نے مجھے میرے رہنے کا کمرہ دکھایا اور مشورہ دیا کہ میں نہا دھو کر لنچ تک ایک دو گھنٹے آرام کر لوں۔

پردہ پوشی' رازداری اور سکوت کی یہ فضا میرے لیے بڑا پراسرار معمہ بنی ہوئی تھی۔ ایک دو بار میرے دل میں خیال گزرا کہ شاید ہمیں ہندوستان کی جانب سے حملے کا خطرہ درپیش ہو؟ لیکن اگر ایسی بات ہے تو مجھے ساتھ لانے کی کیا تک ہے؟ دوسرا خیال آیا کہ شاید کشمیر کے سلسلے میں کوئی مہم شروع ہونے والی ہو؟ لیکن اگر یہ فوجی کارروائی ہے تو اس میں میرا کیا کام؟ میں اسی ادھیڑ بن میں غلطاں و پیچاں تھا کہ شام کے چار بجے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان نے نہایت رازداری سے سرگوشی کر کے مجھے بتایا کہ آج رات اچانک چھاپہ مار کر میاں افتخارالدین کی کمپنی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ کرنے کے لیے سارے انتظامات مکمل کر لیے گئے ہیں۔ اخفائے راز کا اتنا بڑا پہاڑ کھودنے کے بعد جب اتنی ہیچ پوچ اور ادنیٰ سی چوہیا برآمد ہوئی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"بریگیڈیئر صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہ اخبار والے تو اپنے ہاتھ میں صرف قلم لے کر بیٹھتے ہیں۔ توپ و تفنگ سے لیس ہو کر نہیں۔ آپ کے انتظامات تو بظاہر فوجی نقل و حرکت سے کم نظر نہیں آتے۔"

بریگیڈیئر صاحب کھسیانی سی ہنسی ہنس کر چپ رہے۔ میں نے کہا۔ "اب آپ نے یہ اہم راز مجھ پر طشت ازبام کر ہی دیا ہے' تو یہ بھی فرمایئے کہ اس سلسلے میں میرے لیے کیا احکامات ہیں؟"

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان اچھل کر فوراً اپنے مزاج کے بنیادی عنصر میں آ گئے' اور وثوق سے بولے۔ آج تو آپ آرام کریں۔ کل سے ہمیں تمہارے مشوروں کی ضرورت

For more books visit www.4Urdu.com

پڑے گی۔"

اس فارغ وقت کو غنیمت جان کر میں نے پروگرام بنایا کہ شہر چل کر اپنے چند دوستوں سے مل آؤں۔ گاڑی مانگی تو جواب ملا کہ ورکشاپ تک گئی ہوئی ہے۔ جلدی واپس آ جائے گی۔ پیدل چل کر باہر جانا چاہا' تو وہی باداب' خلیق اور شائستہ نوجوان فوجی افسر لپک کر میرے ساتھ ہو گیا۔ تاکہ معزز مہمان کا جی بہلانے کی خاطر اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ میں نے کئی جگہ ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ ان تمام حالات سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ جب سے مجھے آج رات کی مجونہ کارروائی کا راز معلوم ہوا ہے۔ اس وقت سے اس چار دیواری میں میری حالت عملاً ایک نظر بند کی سی ہو گئی ہے نہ میں کہیں جا سکتا ہوں' نہ کوئی میرے پاس آ سکتا ہے۔ نہ میں کہیں ٹیلی فون کر سکتا ہوں نہ مجھے کوئی ٹیلی فون کر سکتا ہے۔ اپنے اوپر بے یقینی اور بے اعتمادی کا اس قدر گہرا غبار چھایا ہوا دیکھ کر میرا وجود میری اپنی نظر میں بڑا حقیر' بے وقار اور فرومایہ محسوس ہونے لگا۔

بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان لاہور کے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے ٹیلی فون لگائے اس طرح مستعد بیٹھا تھا جیسے وہ محاذ جنگ پر کسی فوجی دستے کی کمان کر رہا ہو۔ تین پہر رات گئے جب ڈرائینگ روم سے مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوا' تو اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا قبضہ کسی مزاحمت یا تصادم کے بغیر حکومت کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ اسی کے ساتھ روزنامہ پاکستان ٹائمز' روزنامہ امروز اور ماہنامہ لیل و نہار بھی سرکاری تحویل میں آ گئے۔

اگلے روز پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خان فلیگ سٹاف ہاؤس آئے اور جنرل شیخ کے ساتھ کافی دیر تک مصروف گفتگو رہے۔ ہمیں بعد میں بتایا گیا کہ وہ مسٹر مظہر علی کو اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ پاکستان ٹائمز کی ایڈیٹری بدستور اپنے پاس رکھیں۔ لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔

روزنامہ امروز کے مدیر احمد ندیم قاسمی صاحب تھے۔ میرے ذمہ یہ ڈیوٹی لگی کہ میں ان

For more books visit www.4Urdu.com

کو امروز کی ادارت پر فائز رہنے کی درخواست کروں۔ میں قاسمی صاحب کی خدمت میں یہ گزارش لے کر حاضر ہوا۔ لیکن وہ نہ مانے۔

URDU4U.COM

پاکستان ٹائمز کا اگلا شمارہ پریس میں جانے کے لیے تیار ہوا' تو ایڈیٹوریل کسی نے نہ لکھا تھا۔ جنرل شیخ اور بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ آج کا ایڈیٹوریل میں لکھ دوں۔ مجھے اس میں کلام تھا۔ کیونکہ مجھے نہ صحافت کا عملی تجربہ ہے نہ اداریہ سپرد قلم کرنے کا۔ اس کے علاوہ مجھے تو ابھی تک یہ بھی علم نہ تھا کہ اس اخبار کو حکومت کے قبضہ میں لینے کے لیے کیا کیا محرکات اور مقاصد تھے اور نہ ہی یہ معلوم تھا۔ کہ وہ کیا الزامات تھے جن کی پاداش میں سرکار نے اتنا شدید اور غیر معمولی قدم اٹھایا ہے۔ اس لاعلمی کی وجہ سے میں کوئی پرمعنی اور معقول اداریہ لکھنے سے سراسر قاصر تھا' لیکن بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان بھی انتہائی ضدی اور اڑیل ذات شریف تھے۔ وہ اپنے اصرار پر مسلسل اڑے رہے اور آخر مجبور ہو کر میں جنرل شیخ کے بتائے ہوئے خطوط پر وہیں کھڑے کھڑے بے دلی سے ایک مختصر سا اداریہ گھسیٹ دیا جو New Leaf کے عنوان سے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا۔ یہ تحریر کسی صورت بھی میرے لیے باعث فخر و مباہات نہیں' بلکہ دراصل یہ نامعقولیت اور کج فہمی کے اس پھندے کی عکاسی کرتی ہے جو ایک سرکاری ملازم کو بسا اوقات اپنی مجبوریوں کے دباؤ میں آ کر خواہی نخواہی اپنے گلے میں ڈالنا پڑتا ہے۔

پروگریسو پیپرز لیمیٹڈ کا قلعہ سر کر کے بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان اس قدر شاداں و فرحاں تھے جیسے انہوں نے کسی نہایت سخت محاذ جنگ پر فتح حاصل کر لی ہو۔ رفتہ رفتہ جب ان کی مسرت و انبساط کا جوار بھاٹا فرد ہونا شروع ہوا۔ تو مجھے اس غاصبانہ کارروائی کے پس منظر کے متعلق کسی قدر آگاہی حاصل ہوئی۔ ان اخبارات پر قبضہ جمانے کے لیے مارشل لاء کا کوئی قانون یا ضابطہ جاری نہیں ہوا تھا' بلکہ یہ کارروائی پاکستان سیکیورٹی ایکٹ میں ایک معمولی سی ترمیم کے عمل میں لائی گئی تھی۔ اس کمپنی کے حصہ داروں

For more books visit www.4Urdu.com

میں سب سے بڑے حصے دار میاں افتخار الدین اور ان کا بیٹا عارف افتخار تھے۔ اس حیثیت سے کمپنی کے کاروبار پر میاں صاحب کو مکمل کنٹرول حاصل تھا۔

URDU4U.COM

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ کرنے کے بعد کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرز توڑ ڈالا گیا' اور میاں خاندان کے تمام حصے ضبط کر کے نیلامی پر چڑھا دیے گئے۔ الزام یہ تھا کہ اس کمپنی کے اخبارات چلانے کے لیے بیرونی وسائل سے خفیہ امداد حاصل کی جاتی تھی اور غالباً ثبوت کے طور پر یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ میاں افتخار الدین کے حصص کی ضبطی کے وقت ان کے نام لندن کے لائڈز بنک لمیٹڈ میں تین لاکھ باسٹھ ہزار ایک سو تراسی پونڈ چودہ شلنگ اور چار پنس کی رقم بھی جمع تھی۔

قانونی اور اخلاقی لحاظ سے مجھے یہ سرکاری کارروائی بڑی کمزور' بے قاعدہ اور غیر اصولی نظر آئی۔ جان اور آبرو کے علاوہ ہر شہری کی ذاتی املاک کا تحفظ بھی ہر حکومت کا مقدس فرض شمار کیا جاتا ہے۔ میاں افتخار الدین ایک کھاتے پیتے امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زمینوں کی آمدنی کے علاوہ ان کے بیرون ملک بھی بہت سے تجارتی روابط قائم تھے۔ لاہور میں ان کا گھرانہ نہایت آسودہ اور خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔ پھولوں کی نمائش میں ان کی کوٹھی کے گلاب کئی بار نمایاں انعامات جیت چکے تھے۔ عیش و عشرت کی اس فراوانی کے باوجود وہ نظری' علمی اور ذہنی سطح پر بائیں بازو کے رجحانات کے ساتھ وابستگی کا دم بھرتے تھے۔ عملی طور پر وہ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ بہت سے دوسرے ایسے ادیبوں کو بھی اپنے اخبارات کے ساتھ وابستہ کرتے رہتے تھے' جن کے نام ترقی پسند ادب کی تحریک کے حوالے سے زبان زد خاص و عام تھے سیاست میں انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی قلابازیاں کھائیں۔ کافی عرصہ انڈین نیشنل کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی مونچھ کا بال بنے رہے۔ آزادی کے بعد پاکستان میں چند قدم مسلم لیگ کے ساتھ چلے۔ پھر الگ ہو کر آزاد پاکستان پارٹی کے نام سے اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنالی' جس کا ڈھانچہ مارکسسٹ رنگ ڈھنگ پر تھا۔ اس سے قبل وہ مغربی پنجاب کی مسلم لیگ وزارت میں مہاجرین اور بحالیات کے وزیر بھی

For more books visit www.4Urdu.com

رہ چکے تھے' لیکن زیادہ عرصہ چل نہ سکے' کیونکہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بڑی بڑی زمینداریاں توڑ کر انہیں مہاجرین میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تجویز ان کے دوسرے رفقا خان ممدوٹ' دولتانہ اور سردار شوکت حیات وغیرہ کو کیسے قابل قبول ہوتی؟ آئین ساز اسمبلی میں بھی ان کا رویہ اکثر و بیشتر حکومت وقت کے خلاف ہی رہا۔ جب ۱۹۵۶ء کا آئین منظور ہوا' تو میاں افتخار الدین مغربی پاکستان کے واحد رکن تھے۔ جو مسٹر سہروردی اور کئی دوسرے مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ ایوان سے احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے تھے۔

میاں افتخار الدین آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے امیر کبیر زمیندار اور تاجر تھے۔ قانونی موشگافیاں کرنے اور پکڑنے میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ طبعہ وہ نہایت زیرک' فعال' سیماب صفت اور اپنے موقف پر اڑنے اور لڑنے والے کردار کے مالک تھے۔ مخالفین پر چومکھی وار کر کے انہیں بدحواس رکھنا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اپنے اخبارات کے اس غاصبانہ قبضے پر حکومت کے اس اقدام کو انہوں نے چیلنج تو ضرور کیا۔ لیکن ایک آرڈی ننس کے ذریعے اس معاملے میں عدالت کی جور سڈکشن ختم کر دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد وہ شدید عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے۔ ایک روز اچانک میری ان کے ساتھ لندن میں ملاقات ہو گئی۔ ان کا حلیہ اس قدر بدلا ہوا تھا کہ انہیں دیکھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔ وہ سکون آور دواؤں کے اس قدر زیر اثر تھے کہ دن کے وقت بھی عالم غنودگی میں سوئے سوئے سے نظر آتے تھے۔ ان کی گفتگو میں بھی مجھے ربط کا فقدان محسوس ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ وفات پا گئے۔

لیکن میرے نزدیک میاں افتخار الدین کی وفات کے باوجود یہ سوال جوں کا توں قائم ہے کہ کیا کسی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مروجہ قانونی چارہ جوئی کے بغیر کسی نجی املاک کو زبردستی اپنے قبضہ تصرف میں لے آئے؟ جس نظام میں حکومتوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے پاکستان اس سیاسی یا معاشی نظام پر کاربند نہیں۔ اس سارے معاملے

For more books visit www.4Urdu.com

میں ایک متناقضانہ اور بے محل بات اور بھی کھٹکتی ہے۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر یہ الزام تھا کہ یہ ادارہ کمیونسٹوں سے ساز باز کر کے خفیہ وسائل حاصل کر رہا تھا' لیکن اس کی تطہیر کے لیے حکومت نے جو طریق کار اختیار کیا۔ وہ بھی کمیونزم ہی کی ایجاد و اختراع تھا۔ پرائیویٹ املاک کے تحفظ کو بالائے طاق رکھ کر اسے زبردستی ہتھیانا عام طور پر اسی سسٹم کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

محمد سرفراز کچھ عرصہ تک اس ادارے کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ بعدازاں حکومت نے فیصلہ کیا کہ یہ ادارہ کسی پرائیویٹ پارٹی کے ہاتھ بیچ دیا جائے۔ پاکستان ٹائمز' امروز اور لیل و نہار کو بکاؤ مال دیکھ کر کئی لوگوں کی رال ٹپکنے لگی۔ لیکن نیلامی کی بولی سیٹھ داؤد کے نام ختم ہوئی۔ وہ کروڑ پتی صنعت کار اور تاجر تھے اور حکومت کے اعلیٰ حلقوں میں وہ ازراہ محبت اور مذاق مٹھو سیٹھ کے لقب سے مشہور تھے۔ گجراتی لہجے میں ٹوٹی پھوٹی اردو بول کر وہ افسران بالا کا جی بہلایا کرتے تھے اور خوشامد کے طور طریقوں کو فن لطیف کا درجہ دے کر انہوں نے حکومت کے سب طبقوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر رکھی تھی۔ پیسہ ان کے ہاتھ کا میل تھا۔ سرکاروں درباروں میں انہیں قبول عام کی سند میسر تھی۔ اب صرف اقتدار کا نشہ باقی رہ گیا تھا جسے چکھنے کے لیے وہ بے حد بے چین و مضطرب تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ایک سوچی سمجھی بازی لگائی اور چونسٹھ لاکھ روپے کی عوض پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کی صحافتی جاگیر اپنے نام منتقل کرالی' لیکن یہ سودا انہیں مہنگا پڑا۔ اپنی بڑی بڑی ٹیکسٹائل ملوں اور دوسرے کارخانوں میں تو وہ ہزاروں مزدوروں کو چشم زدن میں اپنی راہ پر لگا لیتے تھے' لیکن اخباری دنیا میں مٹھی بھر صحافیوں کو اپنے قابو میں رکھنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ یوں بھی ان کی تجوری کا منہ گرسنہ بھیڑیے کی طرح کھلا مٹھو سیٹھ کو بار بار کاٹ کھانے کو آتا تھا کہ چونسٹھ لاکھ روپیہ کی سرمایہ کاری پر تجارتی شرح سے میرا منافع کب آئے گا؟ کیسے آئے گا؟ اور کہاں سے آئے گا؟ سیٹھ داؤد پاکستان کے نہایت کامیاب صنعت

For more books visit www.4Urdu.com

کار اور تاجر تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے دس روپے ڈال کر دوسرے ہاتھ سے بیس نکالنے کے عادی تھے' لیکن اخباری کاروبار میں منافع کی صورت بالکل مختلف تھی۔ اس کے علاوہ مٹھو سیٹھ کو گمان تھا کہ اخباروں کے مالک بن کر وہ ایک ایسی لفٹ میں سوار ہو گئے ہیں جس کا بٹن دباتے ہی وہ آناً فاناً اقتدار کی کسی اعلیٰ کرسی پر جا بیٹھیں گے' لیکن ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ اس کے برعکس جسے دیکھو وہ کسی خبر کا شاکی ہے۔ کسی تصویر کا شاکی ہے۔ کسی تنقید کا شاکی ہے۔ نہ پیسہ نہ منافع نہ اقتدار' بلکہ الٹا شکوہ و شکایت کی بھرمار۔ سیٹھ داؤد بہت جلد خسارے کے اس سودے سے بو کھلا گئے اور پروگریسو پیپرز کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ ملک کے اندر تو وہ صدر ایوب کے گرد مکھی کی طرح بھنبھناتے ہی رہتے تھے۔ لیکن ایک دو بار وہ صدر کے بیرون ملک دوروں میں بھی ان کے ساتھ سائے کی طرح چپکے رہے۔ رو پیٹ کر آخر انہوں نے صدر کو راضی کر لیا اور اس متاع گراں کا ایک اور خریدار بھی لاہور سے برآمد کر لائے۔

نئے خریدار کا نام چودھری محمد حسین تھا۔ نیم خواندگی کے باوجود اسمبلی کے ممبر اور لاہور شہر کے میئر تھے۔ ایک روز کسی بیرونی مہمان گرامی کے اعزاز میں شالامار باغ میں ایک نہایت شاندار استقبالیہ منعقد ہو رہا تھا۔ چودھری صاحب میئر کی حیثیت سے خوش آمدید کا ایڈریس پڑھنے۔ سٹیج پر تشریف لائے۔ انہوں نے مائیکرو فون اپنے قریب کرنے کے لیے اسے ہاتھ لگایا' تو اتفاق سے انہیں بجلی کی کرنٹ کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔ بو کھلا کر ان کے منہ سے پنجابی زبان میں ماں بہن کی ایک ایسی فحش گالی نکلی جو لاؤڈ سپیکر کے ذریعے گونج کر سینکڑوں معزز خواتین و حضرات کے مجمع کو شرمساری سے پانی پانی کر گئی۔

اخباروں کے مالک بن کر بھی چودھری محمد حسین صاحب اسی طرح کی بدحواسیوں اور سراسمیگیوں کے چند اور گل کھلانے کے علاوہ کوئی مزید کارنامہ سر انجام نہ دے سکے۔ وہ تکلیف دہ حد تک خالی الذہن اور کودن شخص تھے۔ انہیں جب جاہ کی ہوس تو بے انتہا تھی' لیکن اسے پورا کرنے کے لیے جس عالی حوصلگی' فراخ ہمتی اور اولوالعزمی کی ضرورت

For more books visit www.4Urdu.com

ہوتی ہے۔ اس سے سراسر عاری تھے۔ ان کے منتہائے زندگی کی اڑان غالباً یہیں تک تھی کہ وقتہ فوقتہ انہیں صدر ایوب کی بارگاہ میں رسائی حاصل ہوتی رہے اور ایک دو بار وہ صدر مملکت کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کر سکیں۔ ان کی یہ غرض و غایت پورا ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ اس کے بعد پروگریسو پیپرز کا بکھیڑا اپنے پاس رکھنے ان کے لیے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی' چنانچہ اس ادارے پر ایک بار پھر بہت جلد "برائے فروخت" کی تختی آویزاں ہو گئی۔

تیسرا گاہک نہایت جہاں دیدہ' سرد و گرم چشیدہ' ہوشیار' زیرک' تیزدست اور آزمودہ کار ثابت ہوا۔ یہ گجرات کے چودھری ظہور الٰہی تھے۔ نو دولتیے ہونے کے باوجود وہ خوش اخلاق' ملنسار' اور منکسر مزاج انسان تھے۔ وہ لنگر لنگوٹ کس کر سیاست کے اکھاڑے میں اتر رہے تھے اور جاہ و اقتدار کی سیڑھی پر جلد سے جلد چڑھنا چاہتے تھے۔ گجرات کے گرد و نواح میں ان کی داد و دہش کی دھوم تھی' اور وہ بہت سی بیواؤں اور یتیموں کی کفالت اور نادار طلبہ کے تعلیمی مصارف پر بے دریغ خرچ کرنے میں روز افزوں شہرت اور نیک نامی کما رہے تھے۔ ان کے سیاسی مقاصد کی تکمیل میں "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" جیسے اخبار ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بعجلت تمام ان کا سودا طے کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مالک بن گئے۔ چودھری ظہور الٰہی احتیاط پسند آدمی تھے اور سیاست کے کاروبار میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے تھے۔ صدر ایوب کا اعتماد تو انہوں نے بہت جلد حاصل کر لیا' لیکن نواب کالا باغ کے معاملے میں ان سے ایک بھول چوک سرزد ہو گئی۔ گورنر مغربی پاکستان کے طور پر نواب صاحب صوبے کی سیاست پر بھی اپنی مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ خاص طور پر پنجاب میں سیاسی قیادت کی شکست و ریخت یا ترقی و بقا نواب کالا باغ کے رحم و کرم پر منحصر تھی۔ ان کی رضا اور خوشنودی کے بغیر کوئی نیا سیاستدان اقتدار کی شاہراہ پر ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ شومئی قسمت سے چودھری ظہور الٰہی نے یہ فاش غلطی کی کہ اپنے سیاسی عزائم پر نزول

For more books visit www.4Urdu.com

برکت کے لیے وہ نواب کالا باغ سے اشیر باد حاصل کرنا بھول گئے یا قصداً نظر انداز کر گئے۔ صدر ایوب کی آمرانہ صلاحیتوں پر چودھری صاحب کا مکمل تکیہ تھا۔ صدر مملکت کو رام کر کے غالباً ان کی اپنی نگاہ مغربی پاکستان کی گورنری پر لگی ہوئی تھی۔ یہ افواہ اڑتے اڑتے نواب کالا باغ کے کانوں تک بھی پہنچی اور وہ طیش میں آ کر چودھری ظہور الٰہی کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان کے اشارے پر مقامی انتظامیہ نے انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ وقتہ فوقتہ صدر ایوب نواب صاحب کے پاس چودھری ظہور الٰہی کی صفائی اور سفارش کرتے رہتے تھے' لیکن پھر یکایک حالات بے انتہا بگڑ گئے۔ سہواً یا قصداً "پاکستان ٹائمز" میں گورنر مغربی پاکستان کی کسی معمولی سی علالت کے متعلق ایک چھوٹی سی خبر شائع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک بے پر کی یہ بھی اڑائی گئی کہ بحالی صحت کے لیے آرام کرنے کی غرض سے نواب صاحب کچھ چھٹی بھی لے رہے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر نواب صاحب آگ بگولا ہو گئے اور اسے چودھری ظہور الٰہی کی سازش اور شرارت سمجھ کر انتقامی کاروائیوں پر اتر آئے۔ پہلے ایک نہایت فرسودہ اور غیر معروف مواصلاتی ایکٹ کے تحت انہیں گرفتار کر لیا گیا اور پھر ان پر ایک پریشان کن اور طویل مقدمہ چلنا شروع ہو گیا۔

ایک بار صدر ایوب لاہور کے گورنر ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کے وقت انہوں نے مجھے کسی کام کے لیے بلایا' تو نواب کالا باغ بھی ان کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ صدر ایوب بڑی لجاجت اور نرمی سے چودھری ظہور الٰہی کی صفائی میں کچھ کہہ رہے تھے۔ نواب صاحب کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ اور ان کی مونچھوں کے چھتے میں غیظ اور غضب کے بھونڈ بھنبھنانے لگے۔ پہلے تو انہوں نے فحش گالیاں نکال کر چودھری ظہور الٰہی کی سات پشتوں میں کیڑے نکالے۔ پھر ان کے حکم کے مطابق سپیشل پولیس کی خفیہ برانچ کا ایک ایس پی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک بھاری بھرکم بنڈل تھا۔ کاغذوں کا پلندی پولیس افسر سے لے کر نواب صاحب نے میز

For more books visit www.4Urdu.com

پر دے مارا اور گرج کر بولے۔ "ظہور الٰہی کا تھوڑا سا کچا چٹھا ان کاغذات میں درج ہے' لیکن وہ سخت جان موذی ہے۔ کاغذ کی مار سے نہیں مرے گا۔ اس لیے میں بہت جلد اس پر اپنا شکاری کتا چھوڑنے والا ہوں۔ یہ اس حرامی کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دے گا۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے انہوں نے داد طلب نگاہوں سے پولیس افسر کی طرف دیکھا۔

URDU4U.COM

سپیشل برانچ کے ایس پی صاحب نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنا سر تسلیم خم کیا اور گھگھیا کر انتہائی چاپلوسی سے کہا۔ "جو حکم عالی جاہ۔ بندہ ہر وقت حاضر خدمت ہے۔"

اگر ان صاحب کے دم بھی ہوتی' تو یقیناً وہ کھڑے ہو کر اپنی دم بھی ضرور ہلاتے۔

خفیہ پولیس کا یہ افسر تفتیش کے کام میں شہرت رکھتا تھا۔ ملزموں کو انتہائی شدید جسمانی اور روحانی اذیت پہنچا کر ان سے زبردستی اقبال جرم کروانا اس کا خاص طرہ امتیاز تھا۔ وہ نواب کالا باغ کا منہ چڑھا منظور نظر تھا اور ان کی زبان مبارک سے اپنے متعلق شکاری کتے کا لقب سن کر خوشی اور فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔

نواب صاحب کا یہ جارحانہ رویہ دیکھ کر صدر ایوب کسی قدر آزردگی سے خاموش ہو گئے۔ پہلے بھی کئی بار اس معاملے میں ان دونوں کے درمیان تھوڑا بہت کھچاؤ پیدا ہوتا رہتا تھا۔ لیکن آج صدر ایوب طرح دے گئے۔ کیونکہ چودھری ظہور الٰہی کی خاطر نواب کالا باغ کے ساتھ جھگڑا یا ناچاقی مول لینا انہیں کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔

اگلے روز جب ہم لاہور سے راولپنڈی واپس آ رہے تھے' تو ہوائی جہاز میں صدر ایوب نے مجھے کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ چودھری ظہور الٰہی بہت جلد جان چھڑا کر پروگریسو پیپرز سے بھاگ جائے گا۔ اب اس ادارے کا کیا بنانا چاہیے؟"

موقع پا کر میں نے فوراً اپنی ایک دل پسند تجویز پیش کی' جو پہلے بھی کئی بار نامنظور ہو چکی تھی۔ میری تجویز یہ تھی کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو ایک کوآپریٹو سوسائٹی کی شکل دے کر اس کے سارے حصص کارکن صحافیوں اور دیگر ملازموں کے ہاتھ بیچ دیئے جائیں اور

For more books visit www.4Urdu.com

اخبارات چلانے کی ساری ذمہ داری انہیں سونپ دی جائے۔ وہیں جہاز میں بیٹھے بیٹھے صدر ایوب نے زور سے نفی میں سر ہلا کر اس تجویز کو قطعی طور پر نامنظور کر دیا۔ اس کے خلاف انہیں دو اعتراض تھے ایک تو یہ کہ اخبارات کے مالک بن کر اگر صحافی اور دوسرے کارکن بغاوت کر کے حکومت کے کنٹرول سے نکل گئے' تو اس کا کیا علاج ہو گا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ان اخبارات کو چلانے کے لیے سرمایہ کہاں سے حاصل کیا جائے گا؟ انہیں یقین تھا کہ صحافیوں اور کارکنوں کی کواپریٹو سوسائٹی پر کوئی سیٹھ یا بینک آسانی سے سرمایہ لگانے کے لیے تیار نہ ہو گا۔

میری دوسری تجویز یہ تھی کہ اس لمیٹڈ کمپنی کا کارپوریشن کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز میں حکومت اپنی مرضی کے فدویانہ قسم کے سرمایہ دار نامزد کر سکتی ہے۔ صدر ایوب کی یہ تجویز بڑی قابل قبول نظر آئی۔ انہوں نے فوراً حکم دیا کہ میں ان خطوط پر کوئی عملی سکیم بنا کر جلد از جلد ان کی خدمت میں پیش کروں۔ اس مفت کی بیگار کو اپنے سر سے ٹالنے کے لیے میں نے صدر ایوب سے گزارش کی کہ ہمارے ملک میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی اور واپڈا جیسے عظیم الشان اداروں کو تعمیر کرنے والے مسٹر جی فاروق ماشاء اللہ بقید حیات ہیں۔ میرے خیال میں اس بارے میں ان کے ساتھ مشورہ کرنا مفید ہو گا۔ غالباً یہ بات صدر ایوب کے دل میں بیٹھ گئی اور انہوں نے اپنی نوٹ بک نکال کر اس میں یہ مشورہ درج کر لیا۔

اس کے بعد اس موضوع پر میری کسی سے کوئی مزید بات چیت نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد میں بطور سفیر متعین ہو کر ہالینڈ چلا گیا۔ سات آٹھ ماہ بعد میں نے سنا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ نام کا ایک ادارہ قائم ہو گیا ہے اور مسٹر جی۔ فاروق اس کے پہلے چیئرمین مقرر ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیشنل پریس ٹرسٹ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا' اور پاکستان ٹائمز اور امروز کے علاوہ مارننگ نیوز اور مشرق بھی اس میں شامل ہو گئے۔ مسٹر غلام فاروق کی ماہرانہ قیادت میں قائم شدہ یہ ادارہ اس قدر سخت جان ثابت ہوا

For more books visit www.4Urdu.com

کہ اب تک کوئی حکومت اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکی۔ شروع شروع میں ہر نئی حکومت یہی نعرہ لگاتی ہوئی آتی ہے کہ ہم نیشنل پریس ٹرسٹ کو جلد از جلد توڑ کے رہیں گے لیکن اقتدار کا نشہ منہ کو لگتے ہی یہ سارے دعوے اور عزائم جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹرسٹ کے اخبار حکومت کے حق میں نیاز کی دیگوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان دیگوں میں خوشامد' تملق' چرب زبانی' چکنی چپڑی باتوں' ریاکارانہ گھاتوں اور سرکار کی جا و بیجا تعریف و توصیف کے ایسے چمچے اور کف گیر چلائے جاتے ہیں کہ کوئی حکومت نیشنل پریس ٹرسٹ کو ہاتھ سے کھونے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ٹرسٹ کے اخباروں کی اشاعت مسلسل گرتی رہتی ہے لیکن اس کے طلسماتی بہی کھاتوں میں خسارے کا نشان کبھی نہیں ابھرتا۔ صرف روزنامہ "مشرق" نے ادبی یا ثقافتی ایڈیشنوں کی وجہ سے ایک اپنے چند شگفتہ کالموں کے بل بوتے پر کسی نہ کسی طرح اپنا بھرم قائم رکھا ہوا ہے۔ باقی تینوں اخباروں میں کسی آب و تاب اور رنگینی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ بعض اوقات تو وہ محض سرکاری گزٹ کا پھسپھسا اور بھونڈا سا چربہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

موجودہ صورت میں نیشنل پریس ٹرسٹ کا وجود آزادانہ اور بے لاگ صحافت کے لیے ایک وبال جان سے کم نہیں۔ جب تک صحافت کا یہ سفید ہاتھی حکومت کے تھان میں سونے کی زنجیروں سے بندھا رہے گا۔ اس وقت تک دوسرے اخباروں کے لیے رقیبانہ اور حریفانہ ہم چشمی اور مالی وسائل کے مقابلے کا میدان منصفانہ طور پر ہموار نہیں ہو سکتا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• ایوب خان اور معاشیات

جن دنوں پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا' میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کراچی چھوڑنے سے پہلے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر عمرہ ادا کر آؤں۔ اس مقصد کے لیے مجھے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے کچھ رقم نکلوانے کی ضرورت تھی۔ اے۔ جی۔ پی۔ آر کی ہدایت کے مطابق میں نے ایک فارم بھرا جس پر اپنے ہیڈ آف آفس کے دستخط کروانے بھی لازمی تھے۔ دفتر والوں نے کہا کہ میرے ہیڈ آف آفس بھی صدر ایوب بذات خود ہیں۔ اس لیے مجھے ان سے بھی دستخط کروانا ہوں گے۔ مجھے اس بات میں کسی قدر تردد تھا کہ اتنی چھوٹی سی بات پر ان کو کیا تکلیف دوں۔ لیکن ضابطے کی خانہ پری بھی ضروری تھی۔ اس لیے وہ فارم ان کی خدمت میں دستخطوں کے لیے بھیجدیا۔ ساتھ ہی پندرہ دن کی چھٹی کی درخواست بھی بھیجدی۔

تھوڑی دیر کے بعد صدر ایوب ان کاغذات کو ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مسکرا کر بولے۔ پراویڈنٹ فنڈ تو ریٹائرڈ ہونے کے بعد کام میں لانا چاہیے۔ تم ابھی سے اس میں سے یہ رقم کیوں نکلوا رہے ہو۔"

میں نے اپنی بیوی کے ساتھ عمرہ پر جانے کا ارادہ بتایا' تو وہ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ "اگر ایسا ارادہ تھا تو تنخواہ میں سے پیسہ بچا بچا کر رکھتے۔ پراویڈنٹ فنڈ میں سے کچھ نکلوانا دور اندیشی کی بات نہیں۔"

میں خاموش رہا' تو انہوں نے جیب سے اپنی ذاتی چیک بک نکالی' اور فرمایا۔ "اس رقم کے برابر میں تمہیں اپنا ذاتی چیک دیتا ہوں۔ نصف رقم تم اپنی سہولت سے رفتہ رفتہ واپس ادا کر دینا۔ باقی نصف میرا تحفہ سمجھو۔"

ان کے اس الطاف کریمانہ سے میں بیحد متاثر ہوا' اور شکریہ ادا کر کے انتہائی لجاجت

For more books visit www.4Urdu.com

سے میں نے انہیں سمجھایا' کہ عمرہ جیسے دینی سفر پر مجھے اپنے خرچ ہی سے جانا چاہیے۔ اس کے بعد اگر مجھے کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی فیاضی سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔

URDU4U.COM

یہ سن کر وہ زور سے ہنسے اور بولے۔ "ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے۔" اس کے بعد میرے فارم پر انہوں نے خندہ پیشانی سے دستخط کر دیئے۔

یہ معمولی سا واقعہ مالی' اقتصادی اور معاشی زاویوں سے صدر ایوب کے ذہنی رجحانات اور ذاتی کردار پر نہایت دلچسپ روشنی ڈالتا ہے۔ ان کی نپی تلی فیاضی جذبات سے آلودہ ہو کر بوجھل یا لکھ لٹ نہ بنتی تھی۔ فضول خرچی اور اسراف سے وہ کوسوں دور تھے۔ پس اندازی ان کے نزدیک عقل و دانش اور دور اندیشی کا شعار تھا۔ اور ہر معاملے میں حساب کتاب سے چلنا ان کی عادت ثانیہ تھی۔ ان کے دور حکومت میں اگر یہی ذاتی اوصاف اور مملکتی سطح پر بھی جاری و ساری ہو جاتے' تو پاکستان کا مالی اور معاشی مستقبل نہایت ترقی یافتہ اور خوشحال خطوط پر مستحکم ہو جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ صورت حال پیدا ہونے سے رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک آزاد مملکت کے فلسفہ معاشیات کے علوم و فنون پر عبور رکھنے والے ماہرین کی ہمیشہ شدید کمی رہی ہے۔ صدر ایوب کو اپنے دور میں جو اقتصادی اور معاشی امور کے وزیر' مشیر اور ماہر میسر آئے' وہ یا تو نہایت لائق فائق' قابل اور مستعد اکاؤنٹنٹ تھے یا غیر معمولی طور پر ذہین و فطین سول سرونٹ تھے' جن کا خاص طرہ امتیاز یہ تھا کہ وہ ورلڈ بنک' انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی اصطلاحات اور جارگن نہایت خوش اسلوبی سے اپنا کر اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے تھے۔ ان بلند و بالا' گرنجدار اور پرشوکت الفاظ اور اصطلاحات کی اشکال صوتی میں عقل و دانش' فہم و ادارک اور اقتصادی علوم و فنون کا جو تھوڑا بہت مغز اور گودا ملتا بھی تھا تو اس کی حیثیت ورلڈ بینک کے چھوٹے موٹے مشیروں اور مربیوں کے پس خوردہ اقوال اور مسلمات سے کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اس طرح پاکستان کی جدید اکانومی کا جیٹ طیارہ سیکنڈ کلاس پائلٹوں کے ہاتھ میں آ کر تھرڈ ریٹ پٹرول کے

For more books visit www.4Urdu.com

سہارے بلند ترین فضاؤں میں پرواز کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

فوجی حکومت کے آتے ہی خوف و ہراس کی جو فضا چھا گئی' اس میں مارشل لاء نے چند سطحی لیکن دلچسپ گل کھلائے۔ ذخیرہ اندوزوں' اور بلیک مارکیٹ کرنے والوں نے اپنی دکانوں کے پٹ کھول دیئے اور مخلوق خدا ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ کر گری اور دونوں ہاتھوں سے سستے داموں مال و اسباب خریدنے میں مصروف ہو گئی۔ چند لوگوں نے ناجائز دولت سے بھرے ہوئے سوٹ کیس راتوں رات کھلے میدانوں میں جا پھینکے کروڑوں روپے کا پوشیدہ کالا دھن واجبی ٹیکس ادا کرنے کے بعد ظاہر ہو کر تجارت صنعت کی گردش میں آ گیا۔ مارشل لاء کی عینک لگا کر پولیس کے سراغرسانوں کی بصارت بھی تیز ہو گئی اور ایک روز سمندر کی تہہ میں ڈوبا ہوا ناجائز سونے کا بہت بڑا انبار برآمد کر لیا گیا۔

بیرون ملک چھپا کر رکھے ہوئے سرمائے کو واپس لانے کے لیے مارشل لاء کا ایک ضابطہ نافذ ہوا جس کے تحت ہر شخص اپنا غیر ملکی زرمبادلہ بغیر کسی روک ٹوک کے پاکستان لا سکتا تھا۔ سرکاری شرح مبادلہ پر اس کو پاکستانی روپے پوری تعداد میں مل جاتے تھے۔ اور اس رقم پر کوئی ٹیکس بھی نہ لگایا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس رعایت سے خاطرہ خواہ فائدہ اٹھایا' لیکن بڑے بڑے سیٹھوں کا ایک منظم گروہ اس ضابطہ کو پوری طرح ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا' ان حضرات کو یقین تھا کہ ان کا سرمایہ صرف پاکستان سے باہر ہی محفوظ رہ سکتا ہے' ملک کی سلامتی اور بقا کے بارے میں وہ اس قدر متردد تھے' کہ اپنا سرمایہ یہاں لا کر وہ ہرگز ڈبونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک خفیہ تحریک چلانا شروع کر دی' جس سے وہ اپنے ہم مشرب سیٹھوں اور ساہوکاروں کو تسلی اور تشفی دیتے تھے کہ وہ خواہ مخواہ مارشل لاء کی گیدڑ بھبکیوں میں نہ آئیں' اور اپنا قیمتی زرمبادلہ پاکستان واپس لانے کی غلطی نہ کریں۔ ایک سیٹھ کے محب وطن کارندوں نے یہ راز ایک گمنام خط کے ذریعے صدر ایوب کے نام لکھ کر بھیجدیا۔ اس میں یہ بھی درج تھا' کہ ایم' اے رنگون والا چیئرمین فیڈریشن آف چیمبرز آف کامرس اینڈ اینڈسٹری

For more books visit www.4Urdu.com

جے۔ ایس۔ لوبو سیکرٹری کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری۔ اے۔ کے سومار سیکرٹری پاکستان مرچنٹس ایسوسی ایشن اور احمد۔ اے کریم اور تحریک کے روح رواں ہیں۔

URDU4U.COM

صدر ایوب کے نام اس خط کے ساتھ ایک اور پرچہ بھی منسلک تھا جو میرے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہمیں معلوم ہے کہ دفتر رسم و رواج کے مطابق گمنام خطوط کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن تم اس خط کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہ کرنا۔ کیونکہ ہم اللہ اور رسول کی قسم کھا کر اپنے انکشاف کی سچائی کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر تم نے اس خط کو نظر انداز کیا تو تم بھی قوم کے مجرموں کی پشت پناہی کر رہے ہو گے۔

صدر ایوب کی اجازت سے میں نے اس خط کے مندرجات کو ایک مخبرانہ رپورٹ کی صورت میں منتقل کیا۔ اور اس پر مختلف ذرائع سے انکوائری شروع کروا دی۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے سربرآوردہ اشخاص منظم طور پر یہ سازش کر رہے ہیں' کہ لوگ اپنی پوشیدہ دولت کو ظاہر نہ کریں۔ بیرون ملک جمع کیا ہوا زرمبادلہ واپس نہ لایا جائے اور مہنگائی بڑھانے کی غرض سے مقامی صنعتوں کو go slow پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس تحریک کے سرغنوں کے طور پر رنگون والا' بولو' سومار اور احمد کریم گرفتار کر لیے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ ان حضرات پر مقدمہ بھی ضرور چلایا جائے گا۔ لیکن کسی نامعلوم وجہ سے ایسا نہ ہوا۔ چند ہفتوں بعد میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ چاروں کراچی جیل سے رہا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بات اب تک میرے لیے معمہ ہے کہ اچھا خاصا ثبوت مہیا ہونے کے باوجود ان کے خلاف مزید قانونی کارروائی کیوں نہ کی گئی؟

بیرون ملک جمع کیے ہوئے زرمبادلہ کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ مارشل لاء نافذ ہوتے ہی جو کابینہ بنائی گئی تھی' اس میں مسٹر محمد شعیب وزیر خزانہ کے طور پر مقرر ہوئے تھے۔ وزیر خزانہ کا عہدہ انہوں نے اس شرط پر قبول کیا تھا کہ وہ ساتھ ہی ورلڈ بنک کے ڈائریکٹر بھی بدستور رہیں گے۔ ان دو آسامیوں پر ایک شخص

For more books visit www.4Urdu.com

کا بیک وقت فائز رہنا اصولی طور پر معیوب اور نامناسب تھا۔ ایک آزاد مملکت کے وزیر خزانہ کا ساتھ ہی ساتھ ایک بین الاقوامی بنک کی کی ادنیٰ سی آسامی کے ساتھ چمٹے رہنا ہمارے قومی وقار کے سراسر منافی تھا۔ اس لیے شروع ہی سے میرے دل میں ان کے متعلق کوئی خاص قدر و منزلت نہ تھی۔

جن دنوں میں بیرون ملک جمع کیے ہوئے زرمبادلہ کے سلسلے میں چند بڑے سیٹھوں کے خلاف انکوئری شروع کروانے سے مصروف تھا۔ ایک روز محمد شعیب صاحب میرے دفتر میں تشریف لائے۔ ورلڈ بینک کی ملازمت کی وجہ سے امریکہ میں ان کے کئی لاکھ ڈالر جمع تھے۔ انہوں نے صدر ایوب کے نام ایک درخواست لکھ رکھی تھی کہ انہیں یہ رقم امریکہ کے بینک ہی میں رکھنے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے یہ درخواست میرے حوالے کر کے کہا کہ میں صدر ایوب سے منظور کروا کے اسے جلد از جلد ان کے پاس بھیج دوں گا۔ وزارت کے ساتھ ہی ساتھ ورلڈ بینک کی ملازمت کی وجہ سے شعیب صاحب کے خلاف کچھ قدرے تعصب میرے دل میں پہلے ہی موجود تھا۔ اب ان کی اس درخواست نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میں نے لگے ہاتھوں انہیں کراچی کے بڑے بڑے سیٹھوں کی سازشانہ حرکات کا حال سنایا۔ اور اپنی برخود غلط' عادلانہ اور متقیانہ راست بازی کے جوش میں کہہ بیٹھا۔ "سر' ملک کے وزیر خزانہ کو پاکستان کے اقتصادی ثبات اور استحکام پر دوسروں کی نسبت زیادہ کامل یقین اور اعتماد ہونا چاہیے۔ اگر آپ اعلان کر کے ڈنکے کی چوٹ اپنا بیرونی اثاثہ یہاں لے آئیں' تو اوروں کے لیے یہ نہایت صحت مند اور قابل تقلید مثال قائم ہو گی۔"

میری بات سن کر شعیب صاحب تاؤ میں آ گئے۔ انہوں نے اپنی درخواست جھپٹ کر میرے ہاتھ سے چھین لی اور تیزی سے بولے۔ "بس بس۔ میں یہاں پندو نصائح سننے نہیں آیا۔"

میرے کمرے سے نکل کر وہ سیدھے صدر ایوب کے پاس گئے۔ اور اپنی درخواست پر ان کی منظوری کے دستخط ثبت کرا لائے۔

For more books visit www.4Urdu.com

ایک طرف وزارت خزانہ کی کرسی۔ دوسری طرف ورلڈ بینک کی ڈائریکٹری کا سٹول۔ ان دونوں شناختوں کے درمیان شعیب صاحب کی ذات عجیب و غریب لطائف و ظرائف کا شکار ہوتی رہتی تھی۔ چند بار تو میں بھی ان غلط فہمیوں کی لپیٹ میں بری طرح آیا۔

شعیب اور شہاب میں ایک مبہم سی صوتی مماثلت کے علاوہ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ ایک بار صدر ایوب یوگو سلاویہ کے سرکاری دورے پر گئے تو ہم دونوں بھی ان کے ہمراہیوں میں شامل تھے۔ آخری روز مارشل ٹیٹو نے کچھ تحائف تقسیم کیے۔ مجھے ایک نہایت خوبصورت ریڈیو گرام ملا۔ شعیب صاحب کو ایک نہایت معمولی سی ایش ٹرے ملی۔ وہ میرے سر ہو گئے کہ ہمارے ناموں کی مماثلت سے غلط فہمی ہوئی ہے' اور میرے نام کا تحفہ غلطی سے تمہیں مل گیا ہے۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک گزرا۔ اتفاق سے یوگوسلاویہ کا چیف آف پروٹوکول ادھر سے گزرا تو میں نے اسے روک لیا۔ شعیب صاحب اور میرے تحائف میں غلطی سے ردو بدل کا شبہ بیان کیا' تو وہ مسکرایا اور بولا۔

"کوئی غلطی یا غلط فہمی نہیں ہوئی۔ آپ دونوں کو اپنے اپنے صحیح تحائف ملے ہیں۔"

"لیکن مسٹر شعیب تو منسٹر کا عہدہ رکھتے ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔ "جو تحفہ انہیں دیا گیا ہے وہ ان کے منصب کے شایان شان نظر نہیں آتا۔"

چیف آف پروٹوکول نے کہا۔ "آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر تقریب میں ہم نے وزیر خزانہ کو ان کے منصب کے مطابق درجہ دیا ہے۔ لیکن تحائف میں ہم نے انہیں ورلڈ بینک کا ڈائریکٹر تسلیم کیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" ہمارے صدر کے ملٹری سیکرٹری نے پوچھا۔

"ہمیں اس میں کسی قدر بچت نظر آئی۔" یوگوسلاویہ کے چیف آف پروٹوکول نے کسی قدر تمسخر سے کہا۔

اسی طرح کے ایک دو واقعات صدر ایوب کے دورہ امریکہ کے دوران بھی پیش آئے۔ صدر کینڈی اور مسز کینڈی نے صدر ایوب کے اعزاز میں ماؤنٹ ورنن پر ایک نہایت

For more books visit www.4Urdu.com

شاندار ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے کچھ فاصلہ کشتیوں کے ذریعے طے کرنا تھا۔ پہلی کشتی میں مسٹر اور مسز کینڈی کے ساتھ صدر ایوب اور دوسرے جو لوگ سوار ہوئے ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ شعیب صاحب کو دوسری کشتی میں نسبتاً کم اہمیت والے مہمانوں کے ساتھ بٹھایا گیا۔ اس پر وہ بڑے سیخ پا ہوئے۔ لیکن امریکن چیف آف پروٹوکول سے استفسار کرنے پر یہی جواب ملا کہ ورلڈ بینک کے ڈائریکٹر کے رتبہ کے مطابق انہیں صحیح مقام پر بٹھایا گیا ہے۔

اندرون امریکہ ایک سفر پر ہمیں صدر کینڈی نے اپنے سرکاری جہاز میں بھیجا۔ امریکی محکمہ پروٹوکول کے ایک افسر بھی ہمارے ساتھ شریک سفر تھے۔ ہر نشست پر انہوں نے ہمارے نام کے کارڈ چسپاں کیے ہوئے تھے۔ میری نشست ہمارے ممتاز سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ تھی۔ مسٹر شعیب کی نشست بھی ایک عبدالسلام کے ساتھ تھی جو صدر ایوب کا ذاتی خدمت گار تھا۔ اس بات پر شعیب صاحب کا براندوختہ ہونا قدرتی امر تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر شعیب اور شہاب کی مماثلت کو آڑ بنا کر نشستوں کی رد و بدل کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ اس ناخوشگوار بک بک جھک جھک نے اس قدر طول کھینچا کہ امریکی پروٹوکول افسر نے بیچ بچاؤ کر کے اپنا فیصلہ دیا کہ ورلڈ بینک کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مسٹر شعیب کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔

جس وقت صدر ایوب نے عنان اقتدار سنبھالی تھی' اس وقت ملک میں بیرونی زرمبادلہ کی شدید قلت تھی۔ عام اشیائے صرف کمیاب ہی نہیں تھیں بلکہ ان کی قیمتیں بھی بہت گراں تھیں' بلیک مارکیٹ' ذخیرہ اندوزی' اسمگلنگ' امپورٹ لائسنسوں کی برسر عام خرید و فروخت اور دیگر ہر طرح کی سرکاری مراعات کا کاروبار کھلے بندوں عام تھا۔ کسی نے صدر کو یہ پٹی پڑھا دی کہ ان سب خرابیوں اور نقائص کا تیر بہدف علاج بونس واؤچر سکیم میں مضمر ہے۔ یہ تجویز کسی باضابطہ معاشی اصول یا نظریات پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ اس کی حیثیت ان نفسیات کے ماہر چرب زبان سنیاسیوں کے ٹونے ٹوٹکوں کی سی تھی

For more books visit www.4Urdu.com

جو پہاڑی جڑی بوٹیوں کے گیت گا گا کر مایوس مریضوں کو صحتمندی کا مژدہ سنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔

اس سکیم کے مطابق جو شخص کوئی چیز ایکسپورٹ کر کے جتنا زرمبادلہ کماتا تھا' اس کا ایک خاص حصہ اسے بونس واؤچر کے طور پر عطا کر دیا جاتا تھا۔ جس سے وہ اپنی ضرورت یا مرضی کیمطابق جو کچھ چاہے باہر سے درآمد کر سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایکسپورٹ کا کاروبار ہر کسی کا دلپسند مشغلہ بن گیا۔ جسے دیکھو کوئی نہ کوئی شے برآمد کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں تگ و دو کر رہا ہے۔ بونس واؤچروں کا نرخ بالا ہو گیا۔ آسودہ حال لوگ انہیں اپنا سامان تعیش درآمد کرنے میں بیدریغ خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ دکانوں اور گھروں میں عورتوں کے میک اپ کے اعلیٰ ترین لوازمات عمدہ شرابوں' سربمر ولائتی کھانے پینے کی اشیا کے ڈبوں' فرانسیسی پانی کی بوتلوں' سوس چاکلیٹوں' جرمن کیمروں اور طرح طرح کی ٹافیوں' مٹھائیوں' پنیروں اور بسکٹوں کی ریل پیل ہو گئی۔ بونس واؤچر ہاتھوں ہاتھ مہنگے داموں بکتے تھے اور ان کے عوض امپورٹ کی ہوئی اشیاء اور بھی زیادہ مہنگی ہو کر بازار میں آتی تھیں۔ بونس واؤچر کی برکت سے بین الاقوامی سطح پر پاکستانی روپے کی قیمت گر کر نصف کے قریب رہ گئی' لیکن اندوان ملک ہمارے اقتصادی ماہر صدر ایوب مونچھ کو تاؤ دیکر ان کے منہ سے یہی اعلان کرواتے رہے کہ ہم کسی دباؤ کے تحت اپنے روپے کی قیمت ہرگز ہرگز نہیں گھٹائیں گے۔ سرکاری شرح سے تو ایک پونڈ کی قیمت گیارہ بارہ روپے بنتی تھی۔ لیکن کھلی منڈی میں اس کا بھاؤ ۱۸ سے چوبیس روپے تک اٹھتا تھا۔ پاکستانی کرنسی کی اصلی اور نقلی قیمت میں اتنا بڑا فرق اس کی ساکھ کے لیے انتہائی مضر تھا۔

بونس واؤچر سکیم کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ جو سامان زرمبادلہ کی سرکاری شرح پر بھی درآمد کیا جاتا تھا' بازار میں اس کا نرخ بھی بونس واؤچروں کے ریٹ پر فروخت ہوتا تھا۔ اس سے ہماری ساری درآمدی تجارت کی قیمتوں میں یک بیک شدید اضافہ ہو گیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

اس سکیم میں اگر کوئی مثبت پہلو نظر آیا تو وہ یہ تھا کہ ملک بھر میں شہری آبادی کا ایک چھوٹا سا مڈل کلاس طبقہ امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار میں آ کر زیادہ تر بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی کے سہارے کسی قدر آسودہ حال ہو گیا۔

صدر ایوب صدق دل سے خواہاں تھے کہ ملک میں حقیقی خوشحالی اور آسودگی کا دور دورہ شروع ہو۔ انہیں اکانومی کا خود تو کوئی خاص علم یا تجربہ نہ تھا۔ لیکن ایک مستعد اور چوکس دیہاتی کی عقل سلیم اور سوجھ بوجھ ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس لیے انہیں واقعی یہ احساس تھا کہ بونس واؤچر سکیم کی ملمع سازی خوشحالی کا فریب نظر تو ضرور ہے لیکن خوشحالی کا صحیح راستہ نہیں۔ ایک حقیقت پسند انسان کی طرح وہ اس بات سے بھی بخوبی آشنا تھے کہ جس نظام میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ اس میں کوئی شدید سقم اور کجی ہے۔ لیکن عملی طور پر وہ اپنے مالی اور اقتصادی مشیروں اور ماہروں کے نرغے میں آ کر بے دست و پا ہو گئے' اور اپنی جبلی سمجھ بوجھ اور عقل و دانش کو کسی وقت بھی پوری طرح کام میں نہ لا سکے۔ دراصل ان حضرات کو مالی اور اقتصادی ماہرین کہنا اس اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ بابو قسم کے بڑے عہدے دار تھے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی تعلیم و تربیت یا تو محاسبوں منیبوں اور جمع خرچ نویسوں کے طور پر ہوئی تھی' یا وہ ڈپٹی کمشنر' کمشنر' اور جائنٹ سیکرٹری کے مرحلوں سے بخیر و خوبی گزر کر ملک بھر کے مالیاتی' اقتصادی اور منصوبہ بندی کے امور پر قابض ہو گئے تھے۔ ایک آزاد مملکت کے مسائل کو اس کے اپنے وسائل کے حصار میں رکھ کر حل کرنا انہوں نے کہیں سے نہ سیکھا تھا۔ لے دے کے ان کی دوڑ مغرب کے چند ترقی یافتہ ممالک تک تھی جن میں امریکہ سرفہرست تھا۔ ان سب ممالک کی اپنی اپنی مصلحتیں' اپنی اپنی ترجیحات اور اپنے اپنے مقاصد تھے۔ ہمارے معاشی اور اقتصادی ماہرین کی اکثریت دوسروں کی مصلحتوں' ترجیحات اور مقاصد کے کنویں کے مینڈک بن کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ وہ ہر سال نہایت درست اور صحیح بجٹ بنا لیتے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

خسارہ پورا کرنے کے لیے نئے نئے ٹیکس لگانے میں نہایت چابکدستی اور چرب زبانی سے کام لیتے تھے۔ ہر میزانیے میں تو فیری سرخاب کا پر لگانے کے لیے اور اس پر ترقیاتی منصوبوں کا ملمع چڑھانے کے لیے وہ بیرونی امداد اور قرضے لینے کے لیے دوسروں کے سامنے بے حجابانہ ہاتھ پھیلانے میں بے حد مشتاق ہو گئے تھے۔ غیر ملکی امداد کی بیساکھیوں پر چڑھائی ہوئی ہر اقتصادی اور معاشیاتی عمارت غیر محفوظ اور غیر مامون ہوتی ہے۔ ہم پر جب کبھی کوئی آزمائش کی گھڑی آئی ہے' اس عمارت کا ایک نہ ایک حصہ دھڑام سے زمین بوس ہوتا رہا ہے۔ ایوب خاں کے دور حکومت کو بہت سے لوگ مادی ترقی کا سنہری دور کہتے ہیں۔ بے شک اس میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن جن ناقابل اعتبار اور غیر یقینی سہاروں پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی اسے قائم رکھنے کے لیے ہمیں اب تک ہر زمانے میں طرح طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ خود کفالت کی راہ پر قدم بڑھائے بغیر ہر قسم کی ترقی کی اساس مصنوعی اور ناپائیدار رہتی ہے۔ ہماری روز افزوں ضروریات کا مگرمچھ تو منہ کھلے ہل من مزید کا نعرہ بلند کرتا رہتا ہے' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے دوستوں اور امداد دینے والے بہی خواہوں کی اپنی مصلحتوں کے تقاضوں اور ترجیحات میں زیروبم اور رد و بدل ایک لازمی اور فطرتی امر ہے۔

ہمارے قومی وسائل کو بیرونی ذرائع کا محتاج بنانے کے علاوہ ہمارے نام نہاد اقتصادی ماہرین نے صدر ایوب کو یہ بھی باور کرا دیا کہ پاکستان کی طرح تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کے لیے مادی ترقی کا ایک ہی راستہ ہے جو طویل بھی ہے اور دشوار گزار بھی۔ اس کے علاوہ نہ تو کوئی متبادل راستہ ہے' اور نہ ہی کوئی شارٹ کٹ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان لکیر کے فقیروں نے سرخ فیتے کی مدد سے صنعتی اور تجارتی ترقی کا زین اس طرح آویزاں کر دیا کہ اس پر وہی چیدہ چیدہ' برگزیدہ اور پسندیدہ اشخاص اوپر چڑھ سکتے تھے جو قسمت کے دھنی تھے اور پہلے ہی سے سیڑھی کے ایک نہ ایک پائیدان پر ایستادہ ہو چکے تھے۔ نئی صنعتیں لگانے کے لائسنس یا تو پرانے صنعتکاروں اور تاجروں کو ملتے تھے'

For more books visit www.4Urdu.com

یا ان دوسرے لوگوں کو ملتے تھے جنہیں سیاسی رشوت' اقربا پروری یا کسی دیگر خوشنودی کے طور پر نوازنا مقصود ہوتا تھا۔ یہ دوسرے لوگ لائسنس لے کر انہیں منہ مانگی قیمت پر پرانے صنعت کاروں اور تاجروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ اس طرح بنیادی طور پر صنعت کاروں کا حلقہ اپنے پرانے دائرے کی حدود ہی میں گردش کرتا رہتا تھا۔ اور اس میں تازہ خون بہت کم مقدار میں شامل ہوتا تھا۔ ایک ہی خاندان طرح طرح کی کثیر الانواع صنعتیں لگا لیتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان کا اپنا بینک' اپنی انشورنس کمپنی' اور اپنے ہی تجارتی گودام بھی قائم ہو جاتے تھے۔ اس قسم کے کارٹل ملک میں اس قدر عام ہو گئے کہ قوم کی دولت کا بیشتر اثاثہ بیس بائیس خاندانوں کی تجوریوں میں مرکوز ہو کر رہ گیا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جس پر اس ہندی دوہے کی مثل پوری طرح صادق آتی تھی:

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

شروع شروع میں وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب نے نہایت طمطراق سے یہ اعلان کیا تھا کہ ہم کارٹلز کا قلع قلمع کر کے رہیں گے لیکن دو ڈھائی برس کے اندر اندر انہوں نے قلابازی کھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ کارٹلز بنانے والوں کو رضا کارانہ طور پر انہیں ختم کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد اس موضوع پر زیب داستاں کے لیے اتنی سی بیان آرائی بھی بند ہو گئی۔

مال و زر کی اس تکثیر میں مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں برابر کے شریک تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بنگالی حضرات اپنا لائسنس زیادہ تر مغربی پاکستان میں فروخت کرنے کی کوشش کرتے تھے' کیونکہ یہاں پر خریدار نسبتاً زیادہ تھے اور قیمت بھی غالباً زیادہ ملتی تھی۔ بظاہر اس سے یہی گمان ہوتا تھا کہ اس بندر بانٹ میں مغربی پاکستان کیساتھ

For more books visit www.4Urdu.com

ترجیحی سلوک کیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ اس کے برعکس بنگالی وزیر ارباب سیاست اور ان کے عزیز و اقارب پرمٹوں اور لائسنسوں کی صورت میں اپنی قیمت وصول کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے' اس زمانے میں پان کے تانہ بتانہ پتے بڑی کثیر تعداد میں ہر روز پی آئی اے کے ذریعے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آیا کرتے تھے۔ یہ نہایت منافع بخش تجارت تھی اور ایک ایک ٹوکری فی یوم کا لائسنس حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی سفارشوں اور اثر رسوخ سے کام لیا جاتا تھا۔ ان لائسنسوں کی تقسیم کلیتہ چند بنگالی وزیروں اور بنیادی جمہوریتوں کے اہم ترین ارکان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پہلے اپنے بیٹوں' بھانجوں اور بھتیجوں کا پیٹ بھرتے تھے۔ اور اس کے بعد اپنے سیاسی حلیفوں کی وفاداریاں مستحکم کرنے اور حریفوں پر ترغیب و تحریص کا جال پھیلانے کے کام میں لاتے تھے۔ ایک بنگالی وزیر باتدبیر اس کام میں بے حد پیش تھے۔ جب کبھی وہ کسی کو چند ٹوکروں کا لائسنس دلوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو اپنے ایک چھپے ہوئے خوبصورت کارڈ کے ذریعہ اسے مبارک باد کا خط بھی ضرور بھیجتے تھے۔ اس کارڈ میں کسی من چلے نے بنگالی ترجمہ کے ساتھ فارسی کا یہ مصرعہ بھی درج کروا رکھا تھا

برگ سبز است تحفنہ درویش

حکومت اور سیاست کے درویشوں کے گال اور ہونٹ تو برگ سبز کی برکت سے گلنار ہی رہے تھے' لیکن تحفوں کی اس ہیرا پھیری میں پانوں کے تاجروں کا ایک کثیر طبقہ اپنے آبائی پیشے سے محروم ہو کر بے کاری کا شکار ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے کچھ لوگوں نے اسے یہ رنگ دیا کہ اب تو مغربی پاکستان والے ہمارے روایتی اور خاندانی پیشہ وروں کی روزی چھیننے کے بھی در پے ہیں۔

اسی زمانے میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے چند پروفیسروں نے Economies Two کا شوشہ چھوڑ رکھا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ

For more books visit www.4Urdu.com

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کسی مشترکہ معاشیات کا وجود ممکن نہیں۔ بلکہ دونوں حصوں کے الگ الگ معاشیاتی تقاضے ہیں۔ اس لیے ایکسپورٹ امپورٹ کنٹرول پی۔ آئی۔ اے' پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی اور سٹیٹ بینک سمیت ہر اقتصادی شعبے اور ادارے کو تقسیم کر کے دونوں صوبوں میں الگ الگ طور پر قائم ہونا چاہیے۔ صدر ایوب اس صورت حال پر بہت پریشان تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اس طرز استدلال کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ اگر ملک کی معاشیات اور اقتصادیات مرکز سے ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی' تو رفتہ رفتہ دو سکے رائج ہو جائیں گے' اور اس کے بعد دو الگ الگ ملک عالم وجود میں آ جائیں گے۔

ایک بار صدر ایوب ڈھاکہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں پر انہیں خیال آیا' کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ان پروفیسروں سے مل کر دیکھنا چاہیے کہ دو معاشیات کا شوشہ چھوڑنے سے ان کی اصلی غرض و غایت کیا ہے۔ چنانچہ ایک صبح ہم نے چھ سات نوجوان اور ادھیڑ عمر کے پروفیسروں کو صدر کے ساتھ ناشتے پر مدعو کیا۔ ان میں پروفیسر نورالہدیٰ اور پروفیسر نورالسلام بھی شامل تھے۔ چند جواں سال اساتذہ نے نہایت شدو مد سے تیز تلخ لہجہ میں مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے استحصال کا رونا رویا۔ اور اس کا واحد حل یہی تجویز کیا کہ دونوں حصوں میں اپنی اپنی معاشیات کو الگ الگ فروغ دیا جائے۔ ان کی باتیں نہایت صبر و سکون سے سن کر صدر ایوب نے کہا۔

"آپ سمجھ دار لوگ ہیں۔ کیا دو معاشیات ہمیں دو الگ الگ ملکوں میں تقسیم نہ کر دیں گی۔"

اس پر نسبتاً بڑی عمر کے لوگ تو خاموش رہے۔ لیکن دو تین نوجوان اساتذہ خوشی سے اچھل پڑے۔ ایک نے بے ساختہ کہا۔ "سر! میرے خیال میں موجودہ صورتحال کا بس یہی ایک منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اسے روکنا کسی کے اختیار میں نہیں۔"

ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے ساتھ اس گفت و شنید نے صدر ایوب کو مزید الجھن

For more books visit www.4Urdu.com

اور پریشانی میں ڈال دیا۔ اگلے روز انہوں نے مشرقی پاکستان کے تیس پینتیس سیاستدانوں' اخبار نویسوں اور دیگر اکابرین کے ساتھ مشورہ کرنے کے لیے ایک میٹنگ منعقد کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن انہوں نے آنے سے انکار کر دیا تھا میٹنگ میں صدر ایوب نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ اپنی گفتگو کے تاثرات بیان کئے' اور ایک طویل جذباتی تقریر کے اختتام پر کہا

"اگر آپ نے مغربی پاکستان سے الگ ہونے کا عزم کر لیا ہے تو باہمی زور آزمائی' الزام تراشی اور سر پھٹول کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم سب کو بھائیوں کی طرح ایک میز کے گرد بیٹھ کر خوش اسلوبی اور خیر سگالی سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔"

چند لمحے بالکل سناٹا چھایا رہا۔ اس کے بعد مسٹر نورالدین اور "اتفاق" کے ایڈیٹر مسٹر تفضل حسین عرف مانک میاں سمیت کئی حاضرین نے بیک آواز کہا۔ "ہرگز نہیں۔" ہرگز نہیں۔" ایسی بات تو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں۔"

"Never Never, we do not even dream of it"

اس کے بعد باہمی اتفاق' اتحاد' تعاون اور خیر سگالی پر بہت سی تقریریں ہوئیں۔ کئی مقررین کے گلے وفور جذبات سے رندھے ہوئے تھے۔ مانک میاں کے روزنامہ "اتفاق" کی روش ایوب خاں کی فوجی حکومت اور ان کے نئے آئین کے خلاف رہا کرتی تھی۔ انہوں نے خاص طور پر صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ "مسٹر پریذیڈنٹ ہمارے اختلافات آپ کی حکومت کے خلاف ہیں' اپنے ملک کے خلاف نہیں' میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک میری نسل کے لوگوں کا کچھ اثر و رسوخ باقی ہے' پاکستان کی سالمیت پر کوئی ضرب نہیں آسکتی۔ لیکن ہمارے بعد کیا ہو گا' اس پر ہم نہایت فکر مند ہیں۔"

مانک میاں نے اس بھر محفل میں ایک اور عجیب انکشاف کیا' انہوں نے کہا "ہمیں کئی بار دو بڑی طاقتوں کی طرف سے خفیہ طور پر اسلحہ مہیا کرنے کی پیش کش ہوتی رہتی ہے۔ تاکہ ہم مسلح ہو کر علیحدگی کی تحریک چلا سکیں۔ لیکن ہم نے انہیں ہمیشہ یہی جواب دیا ہے کہ ہمارے اندرونی جھگڑے جو کچھ بھی ہوں۔ ان میں کسی بیرونی مداخلت

For more books visit www.4Urdu.com

کو ہم ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ طاقتیں باقی سب امور میں ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہتی ہیں۔ لیکن پاکستان کو دو لخت کرنے میں دونوں متفق ہیں۔"

URDU4U.COM

اس میٹنگ نے صدر ایوب پر خواب آور گولی کا اثر کیا اور وہ مشرقی پاکستان کے متعلق ضرورت سے زیادہ بخنت ہو کر بیٹھ گئے۔ اب وہ اس صوبے کی ہر پیچیدگی کو اپنی سادہ لوح اثر سے مفرد شکل میں انتہائی سہل بنا کر دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ ایکبار انہوں نے دفعتہ یہ فیصلہ کر دیا کہ مشرقی پاکستان میں جتنے غیر بنگالی افسر ڈیپوٹیشن پر گئے ہوئے ہیں ان سب کو واپس بلا لیا جائے اور آئندہ اس صوبے میں باہر سے کوئی افسر تعینات کر کے نہ بھیجا جائے۔ اس پر بیوروکریسی کے ایک محدود سے طبقے میں معمولی سی واہ وا ہوئی۔ لیکن "سنگباد" ڈھاکہ کے ایڈیٹر ظہور چوہدری نے مجھے کہا۔ "یہ فیصلہ انتہائی غلط اور خطرناک ہے۔ آئندہ یہاں پر مرکز کے خلاف جو زیر زمین مواد پکے گا' اس کا علم آپ کو اسی وقت ہو گا جب وہ لاوا بن کر پھٹ جائے گا۔ اس سے پہلے یہاں کی نوکر شاہی آپ تک کوئی خبر نہ پہنچنے دے گی۔"

ظہور چوہدری کا یہ خدشہ میں نے صدر ایوب کو بتایا تو وہ چڑ کر بولے۔ ظہور چوہدری تو شکوک و شبہات کا دائم المریض ہے۔ اچھی سے اچھی بات سن کر بھی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتا ہے۔"

ایک روز راولپنڈی کے ایوان صدر میں کابینہ کی میٹنگ تھی۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی صدر ایوب نے مجھے حکم دیا کہ میں تین بنگالی وزیروں خان عبدالصبور خاں' فضل قادر چوہدری اور عبدالمنعم خاں کے ساتھ شیخ منظور قادر اور ذوالفقار علی بھٹو کو ساتھ لے کر ان کے کمرے میں آؤں۔ ہم لوگ ان کے کمرے میں پہنچے تو صدر نے کہا۔ "میں نے آپ لوگوں کے ساتھ ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔ غلام فاروق کی جگہ اب مجھے مشرقی پاکستان کے لیے ایک نئے گورنر کی تلاش ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ موقع اب کسی

For more books visit www.4Urdu.com

مشرقی پاکستانی کو ملنا چاہیے۔ اب بتائیے کہ وہاں کا گورنر کون ہو؟

یہ سنتے ہی تینوں بنگالی وزیروں کے چہروں پر حسرت و التجا' خوشامد درآمد الحاح و زاری' ارمان و امنگ کی رنگ برنگ تختیاں کھٹاک سے ثبت ہو گئیں' جن پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "جناب صدر' اس خاکسار میں کیا کمی ہے؟"

چند لمحے سناٹا طاری رہا۔ پھر کمرے میں صدر ایوب کی آواز گونجی۔ "میں بتاتا ہوں مشرقی پاکستان کا نیا گورنر کون ہو گا۔"

گورنری کا طوق اپنی اپنی گردن میں ڈلوانے کے لیے تینوں بنگالی وزیر عقیدت و احترام سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

"عبدالمنعم خاں" صدر ایوب نے نئے گورنر کے نام کا اعلان کیا۔

اچانک عبدالمنعم خاں کی کرسی سے کراہنے کی سی آواز آئی۔ دراصل یہ شادی مرگ کے آثار نہ تھے' بلکہ دوسرے بنگالی وزیروں کی آنکھوں سے دو نالی بندوق کی آتش حسد کے شعلے چھروں کی طرح نکل نکل کر ان کے تن بدن کو چھلنی کر رہے تھے۔

ہم نے سہارا دے کر عبدالمنعم خاں کو کرسی سے اٹھایا۔ باہر آ کر وہ کمر پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اپنی کار کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک بنگالی وزیر نے ہمیں مخاطب کر کے کہا۔ "دیکھو یہ سالا ابھی پوری طرح گورنر تو بنا نہیں' لیکن حرامی کی چال میں ابھی سے گورنری کا رنگ ڈھنگ آ گیا ہے۔"

مشرقی پاکستان کے گورنر کی حیثیت سے عبدالمنعم خاں نے صدر ایوب کے ساتھ پورا پورا حق وفاداری ادا کیا۔ لیکن صوبے کے اندر انہوں نے جبرو استبداد اقربا نوازی' خویش پروری' رشوت ستانیوں اور بدعنوانیوں کے زبردست جھنڈے کھلم کھلا ڈنکے کی چوٹ گاڑ دیئے۔ بنیادی جمہورتیوں کا تعاون اور وفاداری حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ان اداروں کو منافع بخش بدعنوانیوں میں اس طرح لت پت کر دیا جس طرح شہد میں گرنے کے بعد مکھی دوبارہ پرواز کرنے کے قابل نہیں رہتی سائیکون' سیلاب یا قحط کے مصائب میں غلہ' کپڑا' ادویات اور دیگر مراعات بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کچھ تقسیم کرتے تھے

For more books visit www.4Urdu.com

باقی خرد برد کر لیتے تھے' دیہی ترقیاتی پروگرام Rural Works Programme کا سارا کنٹرول بھی انہیں کے ہاتھ میں تھا ان منصوبوں کی بڑی بھاری رقوم ان کے ہاتھوں سے گزرتی تھیں' جن کا بیشتر حصہ ان کی اپنی جیب گرم کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کام کے ٹھیکے فقط اپنے دوستوں اور عزیزوں کو دیتے تھے۔ اور غریب عوام پر فقط دھونس اور دھاندلی جماتے تھے۔ اس عمل سے سارے مشرقی پاکستان میں جگہ جگہ مٹھی بھر لوگ خوشحال اور باقی ساری آبادی ان کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔

جن دنوں میں ہالینڈ میں سفیر کے طور پر متعین تھا' صدر نے مجھے نیویارک ٹائمز (۱۸ جنوری ۱۹۶۵ء کا ایک تراشا بھیجا' جس میں یہ عجیب و غریب خیال آرائی درج تھی۔

Pakistan may be on its way to an economic milestone that so far has been reached by only one other populars country, the United States of America.

اپنے خط میں صدر نے یہ رونا رویا تھا کہ اگر سات سمندر پار کے اخبارات کو ہماری معاشیاتی ترقی کی رفتار کے متعلق اس قدر آگاہی حاصل ہے' تو ہمارے اپنے لوگ آنکھوں پر پٹی باندھے کیوں بیٹھے ہیں اور کھلے دل سے اس بات کا نوٹس کیوں نہیں لیتے؟

نیویارک ٹائمز کی یہ رپورٹ پڑھ کر میں سمجھ گیا کہ اس میں سچائی اور خلوص نہایت کم اور مبالغہ بہت زیادہ ہے۔ لیکن صدر ایوب نے اپنی سادہ لوحڑ سے اسے اپنے دور حکومت کی کامیابی کی سب سے اعلیٰ سند اور دلیل سمجھ رہے تھے۔ ان کے اپنے محکمانہ مشیر بھی خوشامد کے طور پر انہیں اسی قسم کا تاثر دینے میں لگے ہوئے تھے۔ ملک میں نئے کارخانوں کی تعداد تو ہر کوئی بڑھ چڑھ کر بتاتا تھا۔ لیکن یہ کوئی نہ بتاتا تھا کہ ان میں سے کتنے کارخانوں کی مشینری ابھی تک باہر پیٹیوں میں بند پڑی ہے۔ اور کتنے کارخانے اپنی گنجائش اور استعداد سے نہایت کم چل رہے ہیں۔ میں نے صدر ایوب کو لکھا کہ اس قسم کے تلخ حقائق کم و بیش ہمارے اخبار نویسوں کے علم میں ہیں۔ اس لیے وہ ترقیاتی منصوبوں کے متعلق حکومت کے یکطرفہ بیانات پر یقین نہیں لاتے۔ اس

For more books visit www.4Urdu.com

کا واحد علاج یہ ہے کہ متعلقہ شعبے صحیح صورتحال کا سچا اور بے لاگ تجزیہ قوم کے سامنے پیش کریں۔ میرے خیال میں یہ بات انہیں پسند نہ آئی۔ مجھے معلوم ہے کہ نیویارک ٹائمز کا یہی تراشہ انہوں نے میرے جاننے والے کئی دوسرے پاکستانی سفیروں کو بھی بھیجا تھا۔ ان میں سے چند ایک نے انہیں تار کے ذریعے مبارک باد دی' اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں امریکی اخبار کے اس بلند بانگ سرٹیفکیٹ کا پرچار کرنے کا بیڑاہ اٹھایا۔

اپنی تمام تر کمزوریوں' خامیوں' ناتمامیوں اور ادھورا پن کے باوجود مجموعی طور پر ایوب خاں کا دور صدارت پاکستان کی نسبتاً واضح معاشیاتی ترقی کارنامہ تھا۔ صنعت و تجارت کے علاوہ زراعت کے میدان میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے ساتھ (Indus Basin Water Treaty, 1960) صدر ایوب کا ایک امتیازی کارنامہ ہے۔ کچھ لوگ اس معاہدے کے بعید نتائج پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ لیکن زمانہ حال میں یہ معاہدہ ملک کے لیے بے شک ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اسی کی وجہ سے بڑے بڑے بندوں' بیراجوں اور نہروں کی تعمیر ممکن ہوئی۔ منگلا ڈیم مکمل ہوا۔ تربیلا ڈیم پر کام شروع کیا گیا۔ بجلی کی پیداوار میں توسیع سے ہزاروں کی تعداد میں ٹیوب ویل اور الیکٹرک پمپ لگائے گئے جن سے سیم اور تھور سے ماری ہوئی لاکھوں ایکڑ اراضی بازیاب ہو کر قابل کاشت بن گئی۔ یہ کوئی انقلابی اقدامات تو نہیں تھے۔ لیکن ہماری تاریخ میں پہلی بار ایک طویل عرصہ تک امن و امان کی فضا میں معاشیاتی استحکام کی طرف چند مثبت قدم اٹھائے گئے۔ ہمارے عوام کا ایک کثیر طبقہ بھی اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرتا ہے۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• صدر ایوب اور سیاست دان

صدر ایوب کا المیہ یہ ہے کہ وہ سیاستدانوں کے خلاف گرجتے برستے' ان پر لعن طعن کرتے اور ان کے خلاف نفرت و حقارت کے نعرے لگاتے کرسی اقتدار پر قابض ہوئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے لنگر لنگوٹ کس کر بذات خود سیاست کے اکھاڑے میں اتر آئے اور یہیں پر عوام' افواج اور سیاستدانوں کے داؤ پیچ نے انہیں چاروں شانے چت مار گرایا اور گھسیٹ کر اقتدار کے اکھاڑے سے نکال باہر پھینکا۔

سیاست اور سیاستدانوں کے خلاف فیلڈ مارشل کا رویہ کسی گہری سوچ بچار کسی استدلالی چھان بین بالغ نظری کا نتیجہ نہ تھا۔ ان کے ذہن نے بہت سے متفرق اکادکا اور اتفاقی واقعات کو جو کہیں کہیں اور کبھی کبھی رونما ہو چکے تھے' یکجا کر کے کنٹھ مالا کی طرح گلے میں پہن رکھا تھا' ان واقعات کی روشنی میں وہ سیاست اور سیاستدانوں کے خلاف ہر قسم کے الزامات' مفروضات اور نظریات قائم کر کے انہیں حد درجہ ناقص' ناکارہ اور بدراہ ثابت کرنے میں ہمہ وقت کمربستہ رہتے تھے۔ بریگیڈیئر ایف۔ آر۔ خان کے بیوروآف نیشنل ری کنسٹرکشن سے انہوں نے خان لیاقت علی خان سے لے کر اپنے زمانے تک نئے اور پرانے چیدہ چیدہ سیاستدانوں کے کردار' گفتار اور اعمال کے متعلق تفصیلی یاداشتیں مرتب کروا رکھی تھیں' جن کا حوالہ دے کر اس موضوع پر وہ اپنی گفتگو کو نہایت چٹخارے دار اور لچھے دار بنانے کے رسیا تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کو وہ دوسرے سیاستدانوں کی نسبت زیادہ دانمشند مدبر اور قابل احترام تسلیم کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مسٹر حسین شہید سہروردی کے بارے میں ان کا ایک واقعہ بار بار سنانے کے شوقین تھے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۵۰ء کو کراچی میں قائداعظم کے دوسرے یوم وفات کی یاد میں ایک بہت بڑا عام جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے کو خطاب کرنے والوں میں آئین ساز اسمبلی کے صدر

For more books visit www.4Urdu.com

تمیزالدین خان سندھ کے محمد ایوب کھوڑو اور سید میراں محمد شاہ' سرحد کے یوسف خٹک کے علاوہ وزیراعظم لیاقت علی خان بھی شامل تھے۔

URDU4U.COM

نوابزادہ لیاقت علی خان کی طویل تقریر میں مسٹر شہید سہروردی کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس موضوع پر ان کی تقریر کے کچھ حصے جو اخبارات میں شائع ہوئے تھے درج ذیل ہیں:

Pakistan Time, Lahore, 13 September, 1950.

"مسٹر سہروردی آج کل ہر روز تقریریں کرنے اور بیانات جاری کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ کرنے کے بعد یہاں تشریف لائے ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تھا تو اس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس جماعت کو انڈیا مسلم لیگ اور پاکستان مسلم لیگ کے نام سے تقسیم کر کے دو حصوں میں بانٹ دیا جائے' سہروردی نے مخالفت کر کے انڈیا مسلم لیگ کو قائم نہ ہونے دیا اور اپنے اس موقف کا پرچار شروع کر دیا کہ ہندوستان میں اب فرقہ وارانہ بنیادوں پر کسی جماعت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہاں پر ہندو مہاسبھا اور سکھ اکالی دل جیسی فرقی وارانہ پارٹیاں موجود نہیں تھیں؟ سہروردی کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اتحاد ختم کر دیا جائے اور آئندہ وہ اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اب تک ان کا یہی سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ ہے۔"

"اب پاکستان آنے کے بعد بھی مسٹر سہروردی اور ان کی سیاسی جماعت عوامی مسلم لیگ پاکستانی مسلمانوں کے اتحاد اور یقین کو توڑنے مروڑنے میں مصروف عمل ہے۔ سہروردی کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کے حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں..... وہ اس قسم کی باتوں کا پرچار کر کے کس کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں؟ بے شک ہمارے دشمنوں نے یہ کتے ہمارے خلاف بھونکنے کے لیے چھوڑ رکھے ہیں۔ یہ لوگ وطن کے غدار ہیں'

For more books visit www.4Urdu.com

جھوٹے ہیں' منافق ہیں....."

"For whose benefit، I ask، is all this being said؟ The enemies of Pakistan have let losse dogs who talk like this. I say thaey are traitors، liars and hypocrites"

وزیراعظم لیاقت علی خان کی تقریر کے مندرجہ بالا حصے صدر ایوب نے اپنی ایک ڈائری میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج کر رکھے تھے۔ اقتدار میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تک ان کا یہ دستور رہا کہ اپنے چیدہ چیدہ ملاقاتیوں اور نجی محفلوں میں وہ سیاست پر تنقید کرتے ہوئے اس تقریر کا یہ حصہ بھی نہایت چٹخارے لے لے کر سنایا کرتے تھے یہ عمل وہ اتنی بار دہرا چکے تھے کہ میرا اندازہ ہے کہ اس کے بہت سے فقرے انہیں زبانی یاد ہو گئے تھے۔ کئی بار ان کی یہ حرکت بڑی طفلانہ اور مضحکہ خیز نظر آتی تھی' لیکن ان کے ملاقاتیوں اور نجی محفلوں میں شریک ہونے والے افراد کی اکثریت جی حضوریوں پر مبنی تھی' اس لیے کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے ممدوح کو اس بھونڈے اور بچگانہ فعل کی وجہ سے خواہ مخواہ سرمایہ تضحیک بننے سے روکتے۔

سیاست اور سیاستدانوں کو اپنی تنقید کا ہدف بنانے کے ضمن میں صدر ایوب وزیراعظم لیاقت علی خان کے زمانے کی ایک اور مثال بھی بڑے شوق سے بیان کرنے کے عادی تھے۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں حکومت پاکستان نے ایک ایسا قانون نافذ کیا تھا۔ جسے عرف عام میں "پروڈا" کہا جاتا تھا۔ اس قانون کا پورا نام یہ تھا:

Public and Representative office (Disqualification) Act

اس قانون کی زد میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ایسے وزیر' نائب وزیر اور پارلیمانی سیکرٹری آتے تھے۔ جو جانبداری' اقربا پروری اور دیدہ دانستہ بدانتظامی کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ اگرچہ یہ ایکٹ ۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو جاری ہوا تھا' لیکن عملی طور پر اسے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے نافذ العمل قرار دیا گیا۔ یہ قانون سیاسی عہدہ داروں کے سر پر ایک مستقل شمشیر برہنہ کی طرح آویزاں ہو گیا۔ کیونکہ ان پر بدعنوانیوں کے الزامات عائد کر کے

For more books visit www.4Urdu.com

انکوائریاں شروع کروانا اس ایکٹ کی رو سے ہرکس و ناکس کی دسترس میں دے دیا گیا تھا۔ اگر پانچ افراد ایک ایک ہزار روپیہ چندہ کر کے پانچ ہزار کی رقم کے ساتھ کسی مرکزی یا صوبائی وزیر کے خلاف الزامات لگا دیں' تو اسے نہایت آسانی سے "پروڈا" کی صلیب پر لٹکایا جا سکتا تھا۔ الزامات ثابت ہونے کی صورت میں "ملزم" کو دس سال تک کے لیے سیاسی عہدوں سے معطل کرنے کی سزا مقرر تھی۔ اس قانون کا سب سے زیادہ استعمال صوبہ سندھ میں ہوا' جہاں صرف ایک وزیر کو چھوڑ کر صوبائی کابینہ کے تمام وزرائے کرام یکے بعد دیگرے اس ایکٹ کی لپیٹ میں آئے۔ ایک جمہوری دور میں جب کہ صوبوں میں بھی ایک ہی سیاسی جماعت کی وزارتیں قائم تھیں۔ اس قسم کے قانون کا نفاذ بلاشبہ محل نظر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قانون ایک سیاسی ہتھیار کی حیثیت سے عالم وجود میں آیا تھا اور سیاسی مقاصد کے لیے استعمال بھی ہوا' لیکن ستمبر ۱۹۵۴ء میں جب آئین ساز اسمبلی اور گورنر جنرل غلام محمد کے درمیان محاذ آرائی شروع ہوئی' تو اس خوفناک ہتھیار کو گورنر جنرل کے ہاتھ سے چھیننے کے لیے اسمبلی نے یہ قانون منسوخ کر دیا۔ اس مثال کو بار بار دہرا کر اس سے صدر ایوب یہ نتیجہ اخذ کیا کرتے تھے کہ وزیراعظم لیاقت علی خان سمیت پاکستان کی تاریخ کے کسی دور میں بھی حکمرانی کا کوئی بھی سیاسی نظام کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ خاص طور پر برطانوی طرز جمہوریت کا تجربہ ہمیشہ ناکام رہا ہے۔

عنان اقتدار سنبھالتے ہی صدر ایوب نے سیاستدانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے دو قانون نافذ کئے۔ پہلا قانون عرف عام میں "پوڈو" کہلایا۔۔۔۔۔ یعنی 1959 Public Offices (Disqualification) order, 21 March اپنے پیشرو منسوخ شدہ "پروڈا" کی طرح اس کا اطلاق صرف سیاسی عہدیداروں پر ہوتا تھا اور فرد جرم ثابت ہونے پر پندرہ سال تک سیاسی عہدوں پر فائز ہونے سے نااہلیت کی سزا ملتی تھی۔

لیکن صدر ایوب کا مقصد صرف سیاسی عہدیداروں کی بیخ کنی ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ سیاست

For more books visit www.4Urdu.com

کے میدان میں سرگرم عمل تمام عناصر کو کانٹے کی طرح نکال کر باہر پھینک دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد ایک دوسرا قانون بھی نافذ کر دیا۔ جسے "ایبڈو" کے مخفف نام سے شہرت عام نصیب ہوئی۔ یعنی (Disqualification) order, 7 August, 1959 Elective Bodies اس آرڈر کا اطلاق ان سب افراد پر ہوتا تھا' جو کسی سیاسی عہدے پر رہے ہوں یا کسی منتخب شدہ اسمبلی یا ادارے کے رکن بنے ہوں۔ یہ قانون بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے نافذ العمل قرار دیا گیا تھا۔ تاکہ نئے اور پرانے سب سیاستدان اس کے پھندے میں جکڑے رہیں۔

"ایبڈو" کے تحت فرد جرم ثابت ہونے پر ملزم کو چھ برس تک سیاست سے کنارہ کش رہنے کی سزا ملتی تھی۔ البتہ اتنی رعایت ضرور تھی کہ اگر کوئی صاحب عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا نہ چاہتے ہوں' تو وہ رضا کارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے دست برداری کا اعلان کر کے اپنی گلو خلاصی کرا سکتے تھے۔

مشرقی پاکستان سمیت قومی اور صوبائی سطح کے ۹۸ ممتاز سیاستدانوں کے خلاف ایبڈو کی کارروائی کی گئی تھی۔ ان میں سے ۷۰ نے رضاکارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے توبہ کر کے اپنی جان چھڑا لی۔ ان میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ' مسٹر محمد ایوب کھوڑو اور خان عبدالقیوم خان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ۲۸ سیاستدانوں نے اپنی صفائی پیش کر کے مقدمہ لڑا۔ ۲۲ ہار گئے جن میں ایک سابق وزیراعظم مسٹر حسین شہید سہروردی مغربی پاکستان کے سابق گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی اور سید عابد حسین شامل تھے۔ صرف چھ سیاستدان ایسے تھے جو بری ہوئے۔

ان بڑے اور ممتاز سیاستدانوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے' تو اس زمانے کے سیاست کی کوئی اہم شخصیت "ایبڈو" کی زد سے باہر نظر نہیں آتی۔ نمونہ کے طور پر صرف مغربی پاکستان کے چند چیدہ چیدہ نام درج ذیل ہیں:

۱۔ ملک فیروز خان نون' سابق وزیراعظم

۲۔ سردار امیر اعظم خان' سابق مرکزی وزیر

For more books visit www.4Urdu.com

۳۔ حاجی مولا بخش سومرو، سابق مرکزی وزیر
۴۔ مسٹر یوسف اے۔ ہارون، سابق سفیر
۵۔ خان محمد جلال الدین، سابق مرکزی وزیر
۶۔ قاضی محمد عیسیٰ، سابق سفیر
۷۔ مسٹر حسین شہید سہروردی، سابق وزیراعظم
۸۔ مسٹر سی۔ ای۔ گبن، سابق ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی
۹۔ مسٹر ممتاز حسن قزلباش، سابق چیف منسٹر خیرپور
۱۰۔ خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ، سابق وزیر اعلیٰ پنجاب
۱۱۔ پیرزادہ عبدالستار، سابق مرکزی و صوبائی وزیر
۱۲۔ قاضی فضل اللہ، سابق صوبائی وزیر
۱۳۔ پیر الٰہی بخش، سابق صوبائی وزیر
۱۴۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، سابق وزیر اعلیٰ پنجاب
۱۵۔ نواب مظفر علی خان قزلباش، سابق وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان
۱۶۔ سید حسن محمود، سابق صوبائی وزیر
۱۷۔ مسٹر محمد ہاشم گزدر، سابق صوبائی وزیر
۱۸۔ صوفی عبدالحمید، سابق صوبائی وزیر
۱۹۔ خان غلام محمد خان لنڈخور صوبہ سرحد کے سیاستدان
۲۰۔ ارباب نیاز محمد، سابق کرنل پاکستان آرمی
۲۱۔ آغا غلام نبی پٹھان، سابق صوبائی وزیر
۲۲۔ قاضی محمد اکبر، سابق چیئرمین حیدر آباد میونسپلٹی
۲۳۔ مسٹر محمد ایوب کھوڑو، سابق وزیر اعلیٰ سندھ
۲۴۔ مسٹر محمد اکبر خان بگٹی، سابق صوبائی وزیر
۲۵۔ چودھری محمد حسین چھٹہ، سابق صوبائی وزیر
۲۶۔ کرنل محمد امیر خان آف ہوتی، سابق صوبائی وزیر

For more books visit www.4Urdu.com

۲۷۔ ارباب نور محمد خان' سابق صوبائی وزیر
۲۸۔ سید ہادی علی شاہ' سابق میئر لاہور کارپوریشن
۲۹۔ سردار عبدالحمید خان دستی' سابق صوبائی وزیر اور وزیر اعلیٰ
URDU4U.COM
۳۰۔ سید علمدار حسین شاہ گیلانی' سابق صوبائی وزیر
۳۱۔ میر علی نواز خان تالپور' سابق صوبائی وزیر
۳۲۔ چودھری عبدالغنی گھمن' سابق صوبائی وزیر
۳۳۔ سید علی حسین شاہ گردیزی' سابق صوبائی وزیر
۳۴۔ سید عابد حسین' سابق صوبائی وزیر
۳۵۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین' سابق صوبائی ڈپٹی منسٹر
۳۶۔ خان عبدالقیوم خان' سابق وزیر اعلیٰ سرحد
۳۷۔ نواب مشتاق احمد گورمانی' سابق گورنر مغربی پاکستان
۳۸۔ سردار محمد خان لغاری' سابق صوبائی وزیر
۳۹۔ میاں افتخار الدین' سابق رکن مرکزی و صوبائی اسمبلی اور چیئرمین پروگریسو پیپرز لمیٹڈ۔ لاہور

بڑے اور مشہور سیاستدانوں کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں دو ہزار سے اوپر نچلی سطح کے سیاسی کارکن بھی "ایبڈو" کا شکار ہوئے۔ یہ وہ حضرات تھے جو ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کسی وقت بھی کسی اسمبلی' میونسپلٹی' ڈسٹرکٹ بورڈ یا دیگر منتخب شدہ ادارے کے رکن رہ چکے تھے۔

ان اعداد و شمار سے صرف ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ایک فوجی افسر چھاؤنیوں کی محدود فضا میں اپنی عمر عزیز کے باون سال گزارنے کے بعد اچانک مسلح افواج کے ناجائز استعمال سے ایک ہنستی سول حکومت کو زبردستی نکال باہر کرتا ہے اور خود مسند اقتدار پر قبضہ جما کے بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن اس ایک عمل سے یہ لازمی نہیں کہ اس پر عقل و دانش کی ایسی بارش شروع ہو جائے کہ وہ ملک بھر کے تمام اکابرین اور ہزاروں کارکنوں

For more books visit www.4Urdu.com

کو بیک جنبش قلم نااہل' ناکارہ اور نالائق ثابت کرنے میں حق بجانب بھی ہو۔

صدر ایوب کو یہ چسکا تھا کہ "ایبڈو" کی زد میں آئے ہوئے خاص خاص مشہور و معروف سیاستدانوں کی بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کی تفصیلات ان کے اپنے علم میں بھی آئیں۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے باسٹھ ناموں کا انتخاب کیا اور مجھے حکم دیا کہ "ایبڈو" کے تحت مقدمات سماعت کرنے والی خصوصی عدالتوں (Tribunals) سے میں ان سب کے مکمل ریکارڈ حاصل کروں' اور ہر ایک کی بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کا خلاصہ تیار کر کے ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کروں۔

"ایبڈو" کے ان باسٹھ بلند و بالا پہاڑوں کو جب میں نے کھود کھود کر دیکھا' تو ان میں سے بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کی ایسی چھوٹی چھوٹی چوہیاں برآمد ہوئیں جو آج کے ماحول میں انتہائی بے وقعت اور بے ضرر نظر آتی ہیں۔ چند سیاستدانوں پر ان کے مخالفین کی طرف سے وقتاً فوقتاً "غداری" کا الزام ضرور لگ چکا تھا' لیکن کسی فائل میں کسی کے خلاف وطن دشمنی کی کوئی شہادت یا علامت تھی اور نہ کوئی ثبوت تھا۔ ملک کے مفاد کے خلاف کام کرنے کا الزام بھی جگہ جگہ چسپاں تھا۔ لیکن اس کی بنیاد بھی یا تو ذاتی عداوتیں اور مفاہمتیں تھیں یا سیاسی رقابتوں کی وجہ سے ایسے مبہم مفروضوں اور تہمتوں پر مبنی ہوتی تھی جو واقعات اور شواہد کی روشنی میں کسی صورت بھی قابل گرفت قرار نہ پاتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ باسٹھ نامور سیاستدانوں جو کسی نہ کسی وقت وزیر یا کسی اور عہدے پر رہ چکے تھے۔ ان کے خلاف الزامات کی نوعیت عموماً کچھ اس طرح کی تھی:

سرکاری ٹیلی فون اور سٹاف کار کا بے جا استعمال۔

پی۔ اے۔ یا پرائیویٹ سیکرٹری کے لیے ان کے استحقاق سے زیادہ مراعات۔

اپنے انتخابی حلقوں میں ترجیحی طور پر سڑکوں' سکولوں یا ڈسپنسریوں کی تعمیر۔

اپنے بااثر دوستوں' رشتہ داروں یا سیاستدانوں کے علاقوں میں سڑکیں' سکول یا ڈسپنسریاں

For more books visit www.4Urdu.com

تعمیر کرنے میں ترجیح سلوک۔

اپنے بااثر دوستوں' رشتہ داروں' سیاستدانوں یا ووٹروں کے مفاد میں سرکاری افسروں پر دباؤ یا سفارشیں۔

اپنے انتخابی حلقوں اور اپنے دوستوں اور سیاستدانوں کے علاقوں میں پٹواریوں' تھانیداروں' نائب تحصیلداروں اور دیگر سرکاری کارندوں کے تبادلوں اور تقرریوں میں دخل اندازی۔

انتخابات کے وقت دھاندلی کے بلا ثبوت الزامات۔

سرکاری تقرریوں میں پبلک سروس کمیشن کی سفارشات کو نظر انداز کرنے کا رجحان۔

سرکاری دوروں پر سرکاری انتظامات کا سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال۔

محکمانہ اخراجات کا منظور شدہ بجٹ سے بڑھ جانے کی مثالیں۔

ایسے منصوبوں کی مثالیں جن پر اخراجات منظور شدہ تخمینوں سے تجاوز کر گئے۔

بے شمار مثالیں جن میں فلاں فلاں ٹیکس لگائے جا سکتے تھے' لیکن اس لیے نہ لگائے گئے کہ سیاسی حکمران ہر دلعزیز بنے رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

باسٹھ چیدہ چیدہ چوٹی کے سیاستدانوں کے خلاف صدر ایوب نے جب اس قسم کی بے مزہ' پھیکی اور پھسپھسی سی فرد جرم پڑھی' تو وہ بے حد حیران ہوئے۔ انہوں نے تعجب سے کئی بار یہ سوال دہرایا۔ "بس اتنا کچھ ہی ہے؟"

میں نے انہیں یقین دلایا کہ جو فائلیں مجھے دستیاب ہوئی ہیں' ان میں بس اتنا کچھ ہی ہے۔

"اگر یہ بات ہے۔" صدر ایوب نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "تو یہ ساٹھ ستر جغادری سیاستدان دم دبا کر بھاگ کیوں گئے؟ مردانگی سے کام لے کر ایبڈو کا مقدمہ کیوں نہ لڑے؟"

شاید مارشل لاء سے ڈرتے ہوں۔" میں نے کہا۔ "یا شاید عزت بچانے کی خاطر اپنے آپ ریٹائر ہو کر بیٹھ رہے ہوں۔"

"یہ بات نہیں۔" صدر ایوب نے فیصلہ صادر کیا۔ "تمہاری فائلیں ان کا جرم ثابت کریں

For more books visit www.4Urdu.com

یا نہ کریں۔ لیکن ان کے ضمیر مجرم ہیں۔ یہ بات ان کو بخوبی معلوم ہے۔"

کہنے کو تو انہوں نے یہ بات بڑے طمطراق سے کہہ دی' لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ محض دکھاوے کی بہادری کا ابال تھا۔ ایک تجربہ کار فوجی کی طرح ان میں خود حفاظتی اور خود بقائی کی رگ نہایت مضبوط تھی۔ چنانچہ انہوں نے ذہنی طور پر یہ بات گرہ باندھ لی کہ سیاستدان اتنی گلی سڑی فنا پذیر جنس نہیں ہیں جنہیں "ایبڈو" کی تلوار یا رضاکارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے کنارہ کشی ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دے۔

میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ اس کے بعد رفتہ رفتہ انہوں نے ہر وقت موقع و بے موقع سیاستدانوں کے خلاف بدکلامی' گالی گلوچ اور طعن و تشنیع کا برملا اظہار بہت کم کر دیا۔

ساتھ ہی انہوں نے "بنیادی جمہوریت" کا نظام رائج کر کے سر توڑ کوشش کی کہ ملک میں پرانی طرز سیاست کی جگہ ایک بالکل نئی اور انوکھی سیاست کو جنم دیا جائے۔ ان کو یقین تھا کہ بنیادی جمہورتیوں کے تحت جو اسی ہزار نمائندہ منتخب ہوں گے' ان میں کم از کم کچھ لوگ تو ایسے ضرور نکلیں گے جو قابلیت' ذہانت' وجاہت اور صلاحیت میں پرانے سیاستدانوں کے ہم پلہ یا ان سے بھی ارفع و اعلیٰ ہوں۔ لیکن ان کی یہ امید بر نہ آئی۔ البتہ لگے ہاتھوں بنیادی جمہورتیوں کے اسی ہزار منتخب اراکین کا اتنا فائدہ ضرور اٹھایا گیا کہ ان کے ووٹ حاصل کر کے ایوب خان صاحب نے اپنی صدارت پر مہر تصدیق ثبت کروالی۔ اس استصواب رائے کا نتیجہ مجھے آدھی رات کے بعد معلوم ہوا۔ اس وقت صدر ایوب سو چکے تھے۔ اگلے روز صبح سویرے ان کے پاس گیا' تو وہ بیگم ایوب کے ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ان کے حق میں ۷۵۲۸۳ ووٹ ڈالے گئے ہیں جو مجموعی تعداد کا ۹۵.۶ فیصد حصہ ہیں' تو انہوں نے فوراً کاغذ پنسل لے کر ۸۰۰۰۰ میں سے ۷۵۲۸۳ کا ہندسہ تفریق کیا اور کسی قدر مایوسی سے بولے۔ "بلکہ یوں کہو کہ ۴۷۱۷ ووٹ میرے خلاف بھی پڑے ہیں۔" اس کے اس ردعمل سے مجھے

For more books visit www.4Urdu.com

محسوس ہوا کہ وہ اپنے دل کے نہاں خانے میں امید کا چراغ جلائے بیٹھے تھے کہ اس ریفرنڈم میں انہیں سو فی صد ووٹوں سے کامیابی حاصل ہو گی۔ غالباً یہ خوش فہمی ان کی فوجی تربیت کا نتیجہ تھی۔ جہاں کمانڈر کے ایک اشارے پر پوری پلٹن کی پلٹن بے چوں و چرا "فال ان" ہو جاتی ہے!

اس ریفرنڈم کے دو روز بعد ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو انہوں نے صدر پاکستان کے طور پر ازسر نو حلف اٹھایا اور اس کے فوراً بعد آئین سازی کی طرف متوجہ ہوئے۔ جسٹس شہاب الدین کی سرکردگی میں آئین کمیشن نے جو سفارشات پیش کیں' وہ صدر ایوب کو قابل قبول نہ تھیں۔ اب وہ چند ماہرین کو ساتھ لے کر بذات خود آئین کا خاکہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ عمل بڑا طویل' صبر آزما اور بسا اوقات مضحکہ خیز بن جاتا تھا۔ صدر ایوب انتہائی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے ایک طرف وزیر خارجہ مسٹر منظور قادر آئینی مشیر کے طور پر جگہ سنبھالتے تھے۔ دوسری جانب ایک دو قانونی ماہر بیٹھتے تھے۔ سامنے چند ایسے افسر بٹھائے جاتے تھے جو رائے دینے کی ہمت یا اہلیت تو نہیں رکھتے تھے۔ البتہ نہایت سرگرمی سے ہاں میں ہاں ملانے کے خوب ماہر تھے۔ ایسی محفلوں کی روئیداد قلم بند کرنے کے لیے صدر کے سیکرٹری کے طور پر مجھے بھی حاضر رہنا پڑتا تھا۔ کم و بیش گھنٹہ بھر صدر ایوب اپنے "سیاسی فلسفہ" پر تقریر فرماتے تھے۔ جی حضوری حاضر باش سر ہلا ہلا کر اور ہاتھ نچا نچا کر داد دیتے تھے اور منظور قادر صاحب کو یہ فریضہ سونپا جاتا تھا کہ وہ آج کے صدارتی ملفوظات کو آئینی شقوں میں ڈھال کر لائیں۔

ایک روز صدر ایوب نے حسب معمول اپنے "سیاسی فلسفہ" پر ایک طولانی تقریر ختم کی' تو ایک سینئر افسر وجد کی کیفیت میں آ کر جھومتے ہوئے اٹھے اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر عقیدت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "جناب' آج تو آپ کے افکار عالیہ میں پیغمبری شان جھلک رہی تھی۔"

یہ خراج تحسین وصول کرنے کے لیے صدر ایوب نے بڑی تواضع سے گردن جھکائی۔ یہ

For more books visit www.4Urdu.com

سینئر افسر مرزائی عقیدہ سے تعلق رکھتے تھے۔ معاً مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں صدر ایوب سچ مچ اس جھوٹ موٹ کے اڑن کھٹولے میں سوار ہو کر بھک سے اوپر کی طرف نہ اڑنے لگیں۔ چنانچہ اس غبارے کی ہوا نکالنے کے لیے میں بھی اسی طرح عقیدت سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت احترام سے گزارش کی۔ "جناب' آپ ان صاحب کی باتوں میں بالکل نہ آئیں۔ کیونکہ انہیں صرف خود ساختہ پیغمبروں کی شان کا تجربہ ہے۔"

بات بڑھنے لگی تھی' لیکن صدر ایوب نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا اور حکم دیا کہ باہر جانے سے پہلے ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ ہاتھ ملائیں اور گلے ملیں۔

اسی طرح کی چھان پھٹک اور لگاتار محنت کے بعد خدا خدا کر کے صدر ایوب کا آئین مرتب ہوا۔ اس کی نوک پلک درست کرنے کے لیے وقتہ فوقتہ بیرون ملک سے بھی کچھ ماہرین آتے رہے۔ ۱۹۶۲ء کے شروع ہی سے اس قسم کی خبروں اور افواہوں کا تانتا بندھ گیا کہ عنقریب نیا آئین نافذ ہوتے ہی مارشل لاء اٹھ جائے گا اور اس کے بعد ملک میں ازسر نو سیاسی سرگرمیوں کی اجازت مل جائے گی۔ غالباً ۷ یا ۸ فروری کا دن تھا۔ میں ایوان صدر راولپنڈی میں اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک صدر کا ہیڈ اردلی میرے لیے چائے کی پیالی لے کر آیا اور پریشانی کے لہجے میں رازداری سے بولا۔ آج جی۔ ایچ۔ کیو سے کئی جرنیل صدر صاحب سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ گھنٹہ بھر سے میٹنگ چل رہی ہے۔ بیرا چائے لے کر گیا تو ڈانٹ کر نکال دیا کہ ابھی مت آؤ۔ کبھی کبھی اندر سے کافی بلند آواز سنائی دیتی ہے۔ اللہ خیر کرے۔" یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ کیونکہ فوجی جرنیلوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی طویل میٹنگ صدر کے آج کے پروگرام میں درج نہ تھی۔

اس بات کے کوئی نصف گھنٹہ بعد صدر ایوب نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ کسی قدر پریشان سے نظر آتے تھے۔ وہ پھیکے طور پر بددلی سے مسکرائے اور بولے۔ "چند روز قبل اخباروں

For more books visit www.4Urdu.com

میں کسی نجومی نے پیش گوئی کی تھی کہ دنیا عنقریب ختم ہونے والی ہے۔ لیکن آج جو باتیں میں نے سنیں' ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا کا خاتمہ آج ہی ہونے والا ہے۔"

URDU4U.COM

صدر ایوب نے کسی قدر وضاحت سے مجھے بتایا کہ جی۔ ایچ۔ کیو کے سینئر افسر ان پر یہ زور دینے آئے تھے کہ آئین نافذ کر کے مارشل لاء ہرگز نہ اٹھانا۔ اگر ایسا کیا تو حالات بے حد بگڑ جائیں گے۔ زمین پھٹ جائے گی۔ آسمان گر پڑے گا۔ ان کا اصرار تھا کہ صدر ایوب کم از کم پانچ سال اور مارشل لاء کے زیر سایہ آرام سے حکومت کرتے رہیں۔

"آپ نے ان کو کیا جواب دیا؟" میں نے کسی قدر بے صبری سے پوچھا۔

صدر ایوب مسکرائے۔ "میں نے ان کی بات فوراً مان لی۔ اس شرط پر کہ وہ مجھے یہ گارنٹی لا دیں کہ میں پانچ سال ضرور زندہ رہوں گا!"

غالباً صدر ایوب اس بات پر خوش تھے کہ فوجی افسر ان کی دلیل سے لاجواب ہو کر واپس لوٹ گئے ہیں' لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت کے جرنیلوں میں ایسا کوئی مائی کا لال نہ تھا جو صدر ایوب کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا اور اپنا مطالبہ رد ہوتا دیکھ کر علم بغاوت بلند کر دیتا۔ سول حکومت کے علاوہ فیلڈ مارشل کو اب تک فوج پر بھی پورا کنٹرول حاصل تھا۔ البتہ میرے ذہن میں یہ سوالیہ نشان اب تک باقی ہے کہ ملک میں امن و امان کی صورت حال بالکل درست تھی۔ کوئی بیرونی خطرہ بھی سر پر سوار نہ تھا۔ آئین سازی کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ ایک محدود طرز کی لنگڑی لولی جمہوریت کی طرف پیش رفت جاری تھی۔ ایسے ماحول میں آئین نافذ کرنے اور مارشل لاء اٹھانے پر جی۔ ایچ۔ کیو کی اعلیٰ سطح کے جرنیلوں کو اگر اعتراض تھا تو کیوں تھا؟ یہ فروری ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ اس پس منظر میں بعد کے بہت سے واقعات کا زائچہ بنانے کے لیے کسی خاص علم نجوم کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

خدا خدا کر کے یکم مارچ ۱۹۶۲ء کا روز آیا' جب کہ صدر ایوب نے ریڈیو پر تقریر کر

For more books visit www.4Urdu.com

کے اپنے نئے آئین کا اعلان کر دیا۔ اسی روز شام کو کراچی کے گورنر ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس بھی بلائی گئی۔ مشرق اور مغربی پاکستان سے قومی' صوبائی اور دوسری سطح کے اخبارات اور رسائل کے بہت سے مدیر جمع ہوئے۔ نئے آئین میں یہ درج تھا کہ آئین کے نفاذ کے دو برس بعد صدر مملکت کا ازسر نو انتخاب ہو گا۔ کابینہ کے چند وزیروں کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اگر صدر کا انتخاب دو برس کے بعد ہوا تو ان کی وزارت بھی دو برس کے قلیل عرصہ ہی میں ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اپنی وزارتی میعاد کو طول دینے کے لیے انہوں نے یہ چال چلی کہ انہوں نے حیلے بہانے سے صدر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ آئین میں اپنا انتخاب دو کی بجائے پانچ برس کے بعد رکھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ صدر نے بہت سے انقلابی اصلاحات کا ڈول ڈالا ہوا ہے ان اصلاحات کی بیل منڈھے چڑھانے کے لیے دو برس کا وقفہ نہایت ناکافی ہے۔ اس لیے آئین کی رو سے صدر کا انتخاب پانچ برس کے بعد مقرر ہونا چاہیے۔ (اس نکتے پر جی۔ ایچ۔ کیو کے جرنیلوں اور کابینہ کے نامزد وزیروں میں مکمل ہمخیالی تھی۔) لیکن صدر ایوب اپنے ان خیرخواہ وزیروں کے دل کا اصلی مقصد بخوبی بھانپ گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے کسی کی نہ سنی اور آئین میں اپنا انتخاب دو برس کے بعد رکھنے پر ہی مصر رہے۔ یکم مارچ کو پریس کانفرنس سے چند گھنٹے قبل یہ وزرائے کرام صدر مملکت کے اردگرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہے اور دو برس کا عبوری دور بڑھانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے رہے۔ صدر نے انہیں بار بار ڈانٹا ڈپٹا اور اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا' لیکن وہ حضرات بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ انتہائی مستقل مزاجی سے اپنی کوششوں میں لگاتار مصروف رہے۔ یہاں تک کہ دوسری منزل پر دربار ہال میں پریس کانفرنس میں جانے کے لیے جب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے' تو ایک وزیر صاحب نے گھٹنے ٹیک کر صدر ایوب کا راستہ روک لیا اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ "سر' خدا کے لیے عبوری دور کی مدت کچھ تو ضرور بڑھایئے۔"

For more books visit www.4Urdu.com

"اچھا بابا اچھا۔" صدر ایوب نے جھنجھلا کر کہا۔ "میری جان خلاصی کرو۔ میں دو سال کی بجائے تین سال کا اعلان کر دوں گا۔"

URDU4U.COM

یہ سن کر میں نے صدر سے کہا۔ "سر آئین کی جو کاپی ہم صحافیوں میں پہلے تقسیم کر چکے ہیں اس میں تو یہ مدت صریحاً دو سال درج ہے۔ اب اچانک اسے بڑھا کر تین سال کا اعلان کرنا ایک خواہ مخواہ کی عجیب سی پس اندیشی نظر آئے گی۔"

صدر ایوب نے جھنجھلا کر میری طرف دیکھا اور غصے سے بولے۔ "بس بس۔ اب تم بھی مجھے مزید نروس نہ کرو۔ میں صورتحال سے بخوبی نپٹ لوں گا۔"

اس کش مکش اور کھینچا تانی کے بعد صدر ایوب جب پریس کانفرنس میں پہنچے تو ان کا موڈ کافی خراب اور برہم تھا۔ دربار ہال اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نئے آئین کے متعلق صدر نے اپنا تحریری بیان کسی قدر غصیلے لہجے میں اس طرح پڑھنا شروع کیا جیسے وہ محاذ جنگ پہ بیٹھے دشمن پر گولہ باری کر رہے ہوں۔ جب انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ تین برس کے بعد نیا انتخاب لڑیں گے' تو ایک صاحب نے ٹوک کر پوچھا۔ "سر آئین کا جو ڈرافٹ ہمیں تقسیم ہوا ہے۔ اس میں تو دو برس کی مدت درج ہے۔"

"اسے آپ بھول جائیں۔" صدر ایوب نے چڑ کر کہا۔ "میں نے تین برس کا اعلان کیا ہے تو لازماً یہ مدت تین برس کی ہی ہو گی۔"

ایک اور ایڈیٹر نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ "سر' نئے آئین میں کیا ہم اس تبدیلی کو پہلی آئینی ترمیم شمار کرنے میں حق بجانب ہوں گے؟"

یہ سن کر صدر ایوب کا ناریل چٹخ گیا۔ انہوں نے جھلا کر آئینی ترمیم کی اصطلاح پر انتہائی سخت الفاظ استعمال کئے۔ یہ الفاظ سخت ہی نہ تھے' بلکہ ان میں ایک دو غیر ثقہ اور فحش الفاظ بھی در آئے تھے' جن کا استعمال بھری محفل میں بے حد غیر موزوں تھا خاص طور پر جہاں ایک خاتون بھی موجود تھی۔ جونہی صدر ایوب کی نگاہ مشرقی پاکستان

For more books visit www.4Urdu.com

کی اس خاتون صحافی پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر جھینپ گئے اور انتہائی بے بسی سے زیر لب بڑبڑائے۔ "حماقت ہو گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

URDU4U.COM

اس حادثہ کے بعد صدر ایوب کسی قدر سنبھل کر بیٹھ گئے اور صحافیوں کے سوالوں کے جواب نسبتاً تحمل سے دیتے رہے۔ لیکن بنگالی اخبار سنگ باد کے ایڈیٹر ظہور چودھری نے جب پوچھا کہ کیا اخبارات کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ آئین پر آزادانہ تنقید کر سکیں۔ تو صدر صاحب کا مزاج پھر برہم ہو گیا۔ اس روز ساری پریس کانفرنس کے دوران ان کا پارہ بار بار چڑھا اور بار بار اترا۔ میرے تجربہ میں اس پریس کانفرنس میں صدر ایوب کی کارکردگی انتہائی درجہ کی ہلکی' پست' ناکافی اور کمزور تھی۔

۸ جون ۱۹۶۲ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے صدر ایوب نے نیشنل اسمبلی میں جا کر مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کرنا تھا۔ آٹھ بجے وہ تیار ہو کر ایوان صدر کے برآمدے میں آئے' تو جمیل الدین عالی اور میں ان کی تاک میں بیٹھے تھے۔ ہم نے کافی محنت سے کاپی رائٹ قانون کا ایک مسودہ تیار کر رکھا تھا۔ ہماری کوشش تھی کہ مارشل لاء کے دوران ہی یہ قانون آرڈی ننس کے طور پر نافذ ہو جائے تو آسانی رہے گی۔ ورنہ بعدازاں اسمبلی میں جا کر خدا جانے اس کا کیا حشر ہو۔ کیونکہ اسمبلی میں تو لازماً پبلشروں کی لابی بھی اس کے خلاف اپنا اثر و رسوخ بیدریغ استعمال کرے گی۔ چنانچہ جب صدر اپنی کار کی طرف روانہ ہوئے' تو ہم نے انہیں روکا اور برآمدے میں کھڑے کھڑے ہی کاپی رائٹ آرڈی ننس پر ان سے دستخط کروا لیے۔

پریس کانفرنس میں تو ایک صحافی نے آئین میں پہلی ترمیم کا چٹکلا چھوڑ کر صدر ایوب کو آتش زیر پا کر دیا تھا' لیکن اسمبلیوں کا کاروبار شروع ہوتے ہی آئین میں ترمیمات کا طوفان بدتمیزی امڈ آیا اور صدر ایوب بڑی خوش دلی سے ان پر برابر آمنا و صدقنا کہتے رہے۔ پہلی ترمیم آئین نافذ ہونے کے بعد چار روز کے اندر اندر عمل میں آ گئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا اور ایوب خان صاحب کے دور صدارت میں ان کے اپنے بنائے ہوئے آئین میں آٹھ بار ترمیم ہوئی۔ آئین کی ۳۹ دفعات تبدیل

For more books visit www.4Urdu.com

کی گئیں۔ ان میں سے چند دفعات تو کئی کئی بار تبدیل ہوئیں۔ ان میں بعض دفعات کا تعلق صدارتی انتخاب سے تھا اور ترمیم کا واحد مقصد یہ تھا کہ اگلے انتخاب میں ہر قیمت پر صدر ایوب کا پلہ بھاری رہے۔ اس کے علاوہ ایک پورے کا پورا باب تبدیل کر کے بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیا گیا۔ جس سرعت اور تواتر سے ترمیم و تجدید کا یہ عمل وقوع پذیر ہو رہا تھا اس سے یہی شبہ پیدا ہوتا تھا کہ صدر ایوب کے احاطہ فکر میں آئین کے تقدس نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں۔

URDU4U.COM

یوں بھی جن اصولوں کی آڑ لے کر صدر ایوب نے اپنا فوجی انقلاب برپا کیا تھا' بہت جلد وہ بھی ریت کی دیوار کی طرح اسی طرح معدوم ہونے لگے۔ جس طرح ان کے اپنے بنائے ہوئے آئین کا حلیہ تبدیل ہو رہا تھا۔ معاشرے کو سیاسی جماعتوں سے نجات دلانا ان کا ایک نہایت بلند بانگ دعویٰ تھا' لیکن مارشل لاء اٹھے ہوئے ابھی چالیس دن بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ صدر کی منظوری کے ساتھ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ جاری ہوا جس کی رو سے اسمبلیوں کے اندر اور باہر سیاسی جماعتیں ازسر نو بحال ہو گئیں۔ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی صدر ایوب اپنے نام نہاد انقلابی نصب العین کے بلند پایہ ستون سے لڑھک کر دھڑام سے نیچے گرے اور سیاست کی اسی دلدل میں آ پھنسے جس کی سڑاند اور عفونیت مٹانے کے لیے انہوں نے مارشل لاء کا سارا کھڑاگ کھڑا کیا تھا۔

اس نئی صورت حال میں صدر ایوب کا زاویہ نگاہ یکسر بدل گیا۔ اور جو پرانے سیاستدان "ایبڈو" کی زد میں آ کر چھ سال کے لیے معطل ہو چکے تھے' ان کی نظر میں وہ لوگ بھی یکایک پسندیدہ اور قابل اعتماد بن گئے۔ چنانچہ صدر ایوب کے ایما سے قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا کہ "ایبڈو" کے تحت سیاست دانوں پر عائد کی ہوئی پابندیاں اٹھائی جائیں' لیکن اسمبلی میں آئے ہوئے نئے سیاستدانوں کو اس میں اپنے لیے شدید خطرات نظر آئے۔ چنانچہ انہوں نے اس بل کو مسترد کر دیا۔ ان نئے حالات میں صدر ایوب نے پہلے اپنی ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ اس میں دال

For more books visit www.4Urdu.com

گلتی نہ دیکھی' تو پھر ان کی نگاہ انتخاب مسلم لیگ پر پڑی۔ دل ہی دل میں وہ اس جماعت کی قیادت کو ایک طرح سے اپنی جائز وراثت بھی سمجھتے تھے۔ ان کے گرد روز افزوں بڑھتے ہوئے خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کا ایک گروہ رفتہ رفتہ انہیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہا تھا کہ صدر ایوب قائداعظم کے صحیح جانشین پیدا ہوئے ہیں اور جو کام محمد علی جناح ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں پورا کرنا ایوب خان کے مقدر میں لکھا ہے۔ کبھی کبھی چند ایک پیشہ ور روحانی بزرگ بھی انہیں اس قسم کے نوشہ تقدیر کی خوشخبری سنا کر نذرانے میں اپنے لیے کوئی ٹرانسپورٹ روٹ پرمٹ یا امپورٹ لائسنس یا زمین کا پلاٹ حاصل کر لیتے تھے۔ سیاسی گماشتے اور دلال تو خیر کاسہ گدائی ہاتھ میں لیے ہر وقت ان کے گرد منڈلانے کے لیے تیار ہی رہتے تھے۔

صدر ایوب ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے ملک میں سیاست پیسے کا کھیل ہے۔ جس کے پاس دولت کی کمی ہے۔ وہ سیاست میں بھی ناکام ہے۔ چنانچہ انہوں نے بعض سیٹھ صاحبان سے چندہ جمع کر کے ایک اچھی خاصی رقم مسٹر اے۔ کے۔ ایم فضل القادر چودھری کے حوالے کی۔ مشرقی پاکستان کے یہ صاحب پرانے مسلم لیگی تھے۔ پہلے صدر ایوب کی کابینہ میں وزیر تھے۔ بعدازاں قومی اسمبلی کے سپیکر رہے۔ ان کی یہ ڈیوٹی لگی کہ مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کے لیے وہ صدر ایوب کی راہ ہموار کریں۔

ان دنوں مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا مرکز ڈھاکہ بنا ہوا تھا۔ جماعت کی تنظیم نو کے لیے بزرگ مسلم لیگی لیڈر مولانا اکرام خان کے مکان پر پرانے رہنماؤں کے بہت سے اجتماع ہوئے اور مسلم لیگ کونسل کی ایک میٹنگ منعقد کرنے کا اعلان بھی جاری ہوا۔ یہ اعلان سن کر صدر ایوب کے سیاسی دلالوں پر مردنی چھا گئی۔ کیونکہ ڈھاکہ مسلم لیگ کونسل میں بیشتر تعداد ان پرانے' مستند اور کٹر رہنماؤں کی تھی جو صدر ایوب کو اپنی صفوں میں جگہ دینے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے۔ چنانچہ اس کاروبار کو سبوتاژ کرنے کے لیے فضل القادر چودھری صاحب جملہ سازوسامان سے لیس ہو کر بھاگم بھاگ ڈھاکہ پہنچے۔

For more books visit www.4Urdu.com

تفصیلات کا تو مجھے علم نہیں' لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح مولانا اکرم خان کو شیشے میں اتار لیا اور بغیر کوئی وجہ بتائے مولانا نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کا اعلان منسوخ کر دیا۔ ساتھ ہی مسٹر چودھری نے ڈھاکہ سے میرے سیکروفون پر صدر کے لیے پیغام بھیجا' کہ سیاسی مقاصد کے لیے جو فنڈ ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ ختم ہو چکا ہے اور اب انہیں مزید پانچ لاکھ روپے کی فوری ضرورت ہے۔

ایک دو روز بعد یہ خبر بھی شائع ہو گئی کہ عنقریب مسلم لیگ کی ایک نمائندہ کنونشن راولپنڈی میں منعقد ہو گی جس میں ایک ہزار سے زیادہ لیڈر اور کارکن شرکت کریں گے۔ بعدازاں اس کنونشن کا مقام انعقاد راولپنڈی سے تبدیل ہو کر کراچی مقرر ہو گیا۔ مولانا اکرام خان کو اس کنونشن کی صدارت کے لیے پھانسنے کے لیے سر توڑ کوشش ہوئی۔ ان کے انکار پر چند وزیروں نے ان کے اخبار "آزاد" کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دیں۔ لیکن مولانا بدستور اپنے انکار پر اڑے رہے۔

مولانا اکرام خان کی طرف سے مایوس ہو کر کنونشن کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد کو پیش کی گئی' راجہ صاحب انتہائی سلجھے ہوئے' دیانتداری' پرخلوص اور پاکیزہ سیرت انسان تھے۔ جب انہوں نے بھی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا' تو ایک روز صدر ایوب نے مجھ سے کہا۔ "یہ تمہارے دوست راجہ صاحب بھی صرف باتیں بنانا جانتے ہیں۔ ملک کی خدمت کے لیے اگر انہیں کوئی عملی کام سونپا جائے تو جان چھڑا کر بھاگتے ہیں۔ معلوم نہیں بے چارے قائداعظم ایسے بے عمل لوگوں کے ساتھ کیسے گزارہ کر لیتے تھے۔"

میں نے یہ بات راجہ صاحب کو سنائی' تو وہ مسکرائے اور بولے۔ "صدر صاحب کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے کنونشن کی صدارت کے لیے ایک نہایت کارآمد نام تجویز کر دیا ہے اور انہوں نے اسے منظور بھی کر لیا ہے؟"

"وہ کون سا نام ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"چودھری خلیق الزماں۔" راجہ صاحب نے بتایا۔ "اس کام کے لیے ان سے زیادہ اور کون

For more books visit www.4Urdu.com

شخص موزوں ہو سکتا ہے؟"

چودھری خلیق الزماں صاحب بھی پرانے منجھے ہوئے سیاستدان تھے۔ ۱۹۴۰ء کے تاریخی لاہور ریزولیشن کا متن انہیں کا ڈرافٹ کردہ تھا۔ بعض وجوہات سے وزیراعظم لیاقت علی خان

URDU4U.COM

کے زمانے میں مسلم لیگ کے حلقوں میں چودھری صاحب کی حیثیت کسی قدر متنازعہ فیہ چلی آ رہی تھی' لیکن صدر ایوب کی بنائی ہوئی کنونشن مسلم لیگ کو انہوں نے نہایت چابکدستی اور ہنر مندی سے سنبھالا۔ اپنی شیریں بیانی' خوش کلامی اور حکمت عملی سے انہوں نے صدر ایوب کے دماغ سے مسلم لیگ کی قیادت کا کیڑا نکال باہر پھینکا اور رفتہ رفتہ انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل تو ضرور ہو جائیں' لیکن ایک عام رکن کی حیثیت سے! چنانچہ مئی ۱۹۶۳ء میں ایوان صدر راولپنڈی میں ایک خاص گورنر کانفرنس منعقد ہوئی۔ مرکزی وزیروں کے علاوہ بعض چیدہ چیدہ صوبائی وزیر بھی اس میں شامل ہوئے۔ کنونشن مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں خصوصی دعوت پر شریک محفل ہوئے۔ موضوع بحث یہ تھا کہ صدر ایوب کو کنونشن مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کرنی چاہیے یا نہیں۔ چودھری خلیق الزمان نے ایک فصیح و بلیغ طولانی تقریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صدر ایوب کا مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کرنا ہی ملک اور قوم کے بہترین مفاد میں ہے۔ اس کے بعد نواب کالا باغ سمیت تمام حاضرین نے یکے بعد دیگرے اس تجویز کی نہایت شدت سے تائید کی۔ چنانچہ مبارک سلامت کے غلغلے میں صدر نے دو فارموں پر دستخط کر کے کنونشن مسلم لیگ کی دہری رکنیت حاصل کر لی۔ ایک مشرقی پاکستان کی طرف سے' دوسری مغربی پاکستان کی جانب سے۔ اس کے بعد دعائے خیر ہوئی۔ پھر کسی من چلے نے رکنیت کا فارم نواب کالا باغ کے سامنے رکھ دیا کہ وہ بھی اس پر دستخط کر کے کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ نواب صاحب نے جھٹک کر یہ فارم اس طرح کھینچ کر دور دے مارا' جیسے ان کے دامن پر کوئی

For more books visit www.4Urdu.com

بچھو آ گرا ہو' ساتھ ہی وہ کسی قدر ناراضگی سے بولے۔ "ارے بابا۔ مجھے معافی دو۔ مجھے خواہ مخواہ اس گندگی میں کیوں گھسیٹتے ہو۔"

URDU4U.COM

اتفاق سے یہ فقرہ صدر ایوب نے بھی سن لیا۔ حیرت اور شکایت کے ملے جلے انداز سے گھور کر وہ کچھ لب کشائی کرنے والے تھے کہ نواب صاحب نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا اور انتہائی لجاجت اور انکساری سے کسمسا کر بولے۔ "عالی جاہ۔ گورنر تو جناب کے لگائے ہوئے ادنیٰ غلام ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح گورنروں کو بھی سیاست سے الگ رکھنا ہی مناسب ہو گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے تائید حاصل کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خان کی طرف دیکھا' جو ناک سکیڑے اور تیوریاں چڑھائے اپنے گلے سے فوں فاں' غوں غاں' شوں شاں قسم کی بے معنی سی آوازیں برآمد کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے انداز سے کسی پر یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ وہ نواب صاحب کے موقف کی تائید کر رہے ہیں یا تردید۔

اس کے چند روز بعد ایک شادی کی تقریب میں میری ملاقات چودھری خلیق الزماں صاحب سے ہوئی۔ وہ نہایت ہشاش بشاش اور خوشگوار موڈ میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔

"لو میاں شہاب' میں نے تمہارے فیلڈ مارشل کی فوجی وردی اتار کر انہیں مسلم لیگ کے دونی مارکہ کارکنوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔"

"چودھری صاحب' اب تو یہ فرمایئے کہ مسلم لیگ اور ایوب خان دونوں کا اپنا کیا حشر ہو گا؟" میں نے سوال کیا۔

چودھری خیق الزمان نے چہک کر ایک زور کا قہقہہ لگایا اور پھر انہوں نے لہک لہک کر یہ شعر پڑھا:

For more books visit www.4Urdu.com

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ہمارے قریب ہی ایک صاحب ہماری باتوں کی طرف کان لگائے ہمہ تن گوش کھڑے تھے۔ شعر سن کر وہ بدکے اور کان کھجاتے ہوئے ہمارے درمیان آ کھڑے ہوئے آتے ہی انہوں نے اسی بحر' قافیہ اور ردیف میں ایوب خان اور مسلم لیگ کے متعلق ایسے فحش اور مغلظات سے برے ہوئے اشعار سنانے کا تانتا باندھ دی اکہ الحفیظ و الامان۔ چودھری خلیق الزماں تو چپکے سے وہاں سے کھسک گئے' لیکن چند دیگر لوگوں نے آ کر ہمیں گھیر لیا اور ایک ایک فحش شعر پر بڑھ چڑھ کر داد دینے لگے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شعر سنانے والے صاحب چودھری خلیق الزماں کے بھائی تھے اور ان کا اسم گرامی غالباً مشفق الزماں تھا۔ سنا ہے کہ ان کے پاس بہت سے موضوعات پر فحش اور غلیظ اشعار کا بہت بڑا ذخیرہ موجود رہتا تھا اور ایسے اشعار سناتے وقت ترنگ میں آ کر وہ خواتین اور بچوں کی موجودگی کا بھی کوئی لحاظ نہ فرماتے تھے۔

میرے نزدیک بھی صدر ایوب کا سیاست کے خارزار میں قدم رکھنا ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ بدشگونی کے طور پر ان کا پہلا قدم ہی ایک پیچیدہ تخریب کا باعث بن گیا۔ وہ یہ کہ قائداعظم کی مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو کر کنونشن مسلم لیگ اور کونسل مسلم لیگ بن گئی۔ اس طرح بٹ کر یہ جماعت مستقبل میں کوئی موثر کردار ادا کرنے سے قطعاً معذور ہو گئی۔ موجودہ زمانے میں مزید حصے بخرے ہو کر یہ تین گروہوں میں بکھر گئی ہے جن کا وجود اصولوں کے بجائے چند شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ قیوم مسلیم لیگ خواجہ خیر الدین لیگ اور پیر پگارا مسلم لیگ۔ ان تینوں گروہوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو قومی سطح پر کسی سنجیدہ اور باوقار قیادت کا علمبردار ہو۔

سیاست میں داخل ہو کر مسلم لیگ کی شکست و ریخت کے علاوہ صدر ایوب نے اور

For more books visit www.4Urdu.com

کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ سیاست پر انہوں نے اپنی الگ کوئی خاص چھاپ نہیں لگائی' بلکہ اس کے برعکس وہ مروجہ سیاست کے انہی ٹیڑھے ترچھے سانچوں میں برضا و رغبت ڈھلتے گئے' جن کی تطہیر کے لیے انہوں نے مارشل لاء کا سوانگ رچایا تھا۔

اگر ۸ جون ۱۹۶۲ء کو مارشل لاء اٹھانے کے بعد صدر ایوب اپنا وضع کردہ آئین قومی اسمبلی کے سپرد کر کے کہتے کہ سپر دم بتومایہ خویش را۔ تو دانی حساب کم و بیش را۔ اور اس کے بعد خود کنارہ کش ہو کر گوشہ عافیت اختیار کر لیتے' تو تاریخ کا دھارا کوئی اور رخ اختیار کرتا؟

فیلڈ مارشل لاء کی وفات سے کئی ماہ پہلے یہی سوال میں نے ان کے سامنے اسلام آباد میں دہرایا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر سنجیدگی سے بولے۔ "تمہارا یہی سوال ہے نا کہ مارشل لاء اٹھا کر اور نیا آئین نیشنل اسمبلی کے سپرد کر کے اگر میں گھر آ بیٹھتا' تو پھر کیا ہوتا؟ میرا جواب سن لو کہ پھر یقیناً جنرل موسیٰ ہوتا۔"

جنرل موسیٰ اس زمانے میں پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف تھے۔

سات برس بعد جب صدر ایوب واقعی گھر آ کر بیٹھ رہنے پر مجبور ہو گئے' تو ان کی جگہ آئین کے مطابق قومی اسمبلی کے سپیکر نے نہ لی' بلکہ جنرل یحییٰ آئین منسوخ کرنے کے بعد مارشل لاء لگا کر اقتدار سنبھال بیٹھے۔

یہ بھی تاریخ کی ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ پاکستان میں آئین بنتے ہی ایک نہ ایک فوجی جرنیل اس کا سر کچلنے کے لیے مارشل لاء کا گرز اٹھائے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ چودھری محمد علی والا آئین تین برس چل کر جنرل ایوب خان کے ہاتھوں منسوخ ہو گیا۔ ایوب خان کا آئین سات برس بعد جنرل یحییٰ خان نے پاؤں تلے روند ڈالا۔ ۱۹۷۳ء کا ہمہ جماعتی متفقہ آئین بھی۔ ۱۹۷۷ء سے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء میں ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے! آئین کی پے در پے پامالی کے بعد وطن عزیز میں اس افسوسناک اور تشویشناک صورت حال کی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا اس کہ وجہ آئین کی متواتر اور مزمن

For more books visit www.4Urdu.com

بے وقعتی ہے؟ یا شعبہ سیاست کی کم مائیگی و بدحالی ہے یا بری فوج کے کمانڈر انچیف کی نفسیات میں ایسے اجزا شامل ہو گئے ہیں کہ سول حکومت پر قبضہ جمانے کی ترغیب کے سامنے اس کی قوت مزاحمت جواب دے جاتی ہے؟

صدر ایوب کے آئین کے نفاذ کے سوا سال بعد جب میں بطور سفیر تعینات ہو کر ہالینڈ جا رہا تھا' تو میں اس وقت کے بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ کو خدا حافظ کہنے جی۔ ایچ۔ کیو۔ گیا۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ صاف اندازہ ہو گیا کہ جنرل موسیٰ بڑی بے چینی سے اس امر کا جائزہ لے رہے ہیں کہ اگر وہ مارشل لاء کے ذریعے صدر ایوب کی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ تو اس کارروائی پر ملک بھر میں کیا ردعمل ہو گا؟ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی ہمت کی کمی اور شخصیت کی کمزوری کی وجہ سے وہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کبھی کوئی معمولی سا قدم بھی اٹھانے سے معذور ہے' البتہ ان کے بعد آنے والے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان کا حال دوسرا تھا۔ کمانڈر انچیف کے طور پر یحییٰ خان کا انتخاب اخباروں میں شائع ہوا' تو کئی خفیہ نویس اداروں نے صدر ایوب کو یہ رپورٹیں بھیجیں کہ اس خبر کے بعد ملتان' لاہور اور راولپنڈی میں یحییٰ خان کے قریبی رشتہ داروں نے بغلیں بجائیں' چراغاں کیا' اور اس اعلان کے ساتھ مٹھائی بانٹی کہ "اب صدارت ہمارے گھر میں آ گئی ہے۔"

خدا کرے موجودہ مارشل لاء کی حکومت ہمارے وطن عزیز میں اس طرز کی آخری حکومت ثابت ہو۔ اس کے بعد مسلح افواج برضا و رغبت اپنے پیشہ ورانہ دائرہ کار میں قناعت پذیر ہو کر ترقی اور عروج کی منزلیں طے کریں۔ عدلیہ اور سیاست آزاد ہو کر اپنا فطری کار منصبی سنبھالیں۔ جمہوری ادارے ازسر نو قائم ہوں۔ پے در پے انتخابات اس لیے بھی لازمی ہیں کہ سیاسی عمل سے چھن دھن کر نئی قیادت جنم لے۔ نئی قیادت ہماری سب سے اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ پرانی قیادت جو کسی نہ کسی وقت عملی یا ذہنی یا جذباتی طور پر مارشل لاء کی آکسیجن سے چوری چھپے سانس لے لے کر سسکتی رہی ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

اب مکمل طور پر دم توڑ چکی ہے اور کوئی سیاسی معجزہ اب اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ مستقبل اب نئی قیادت کا منتظر ہے۔ اس وقت تک ایک خلا کی سی کیفیت طاری رہے گی۔ جس کے متعلق یہ بھی ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خانہ خالی را دیوی گیرد۔

URDU4U.COM

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• صدر ایوب اور طلباء

مرکزی وزارت تعلیم کا سیکرٹری متعین ہونے سے پہلے صدر ایوب ایک روز مجھے اپنے ساتھ اپنے آبائی گاؤں ریحانہ لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ان کی والدہ محترمہ' جو اس وقت بقید حیات تھیں' آج ان سے شدید ناراض ہیں اور ان کے ساتھ ملاقات نہیں کریں گی۔ یہ خبر سن کر صدر صاحب پریشان ہو گئے اور اپنے چند عزیزوں کی وساطت سے اپنی والدہ کی خفگی کی وجوہات معلوم کرنے میں مصروف ہو گئے۔

کسی قدر تگ و دو کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ صدر ایوب کی والدہ محترمہ کو ان کے خلاف تین شکایات تھیں۔ ایک شکایت یہ تھی کہ پریذیڈنٹ ہاؤس کی موٹر کاریں جب کسی کام پر گاؤں میں آتی ہیں' تو یہاں کی چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر وہ بڑی تیز رفتاری سے چلتی ہیں جس سے لوگوں کی جان و مال کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ جو گاڑی بھی گاؤں میں آئے وہ آرام سے آہستہ اور احتیاط کے ساتھ چلے۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ گاؤں کے کئی لڑکے کالج کی تعلیم ختم کر کے گھروں میں بے کار بیٹھے ہیں۔ ان کو نوکری کیوں نہیں ملتی؟ اگر نوکری نہیں ملتی تھی' تو کالجوں میں پڑھایا کیوں گیا؟

بڑی بی کو تیسری شکایت یہ تھی کہ میری زمین کا پٹواری ہر فصل کے موقع پر پچاس روپے فصلانہ وصول کر کے خوش رہا کرتا تھا' لیکن اب وہ زبردستی سو روپے مانگتا ہے' کیونکہ وہ کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا اب پاکستان کا حکمران ہو گیا ہے۔ اس لیے پچاس روپے کا نذرانہ میرے لیے بہت کم ہے۔ بڑی بی کو گلہ تھا کہ ایوب خان کی حکومت میں رشوت کا ریٹ ڈبل کیوں ہو گیا ہے؟

واپسی پر صدر ایوب نے اقبال کیا کہ اماں کہ پہلی شکایت کا ازالہ ناممکن ہے' کیونکہ